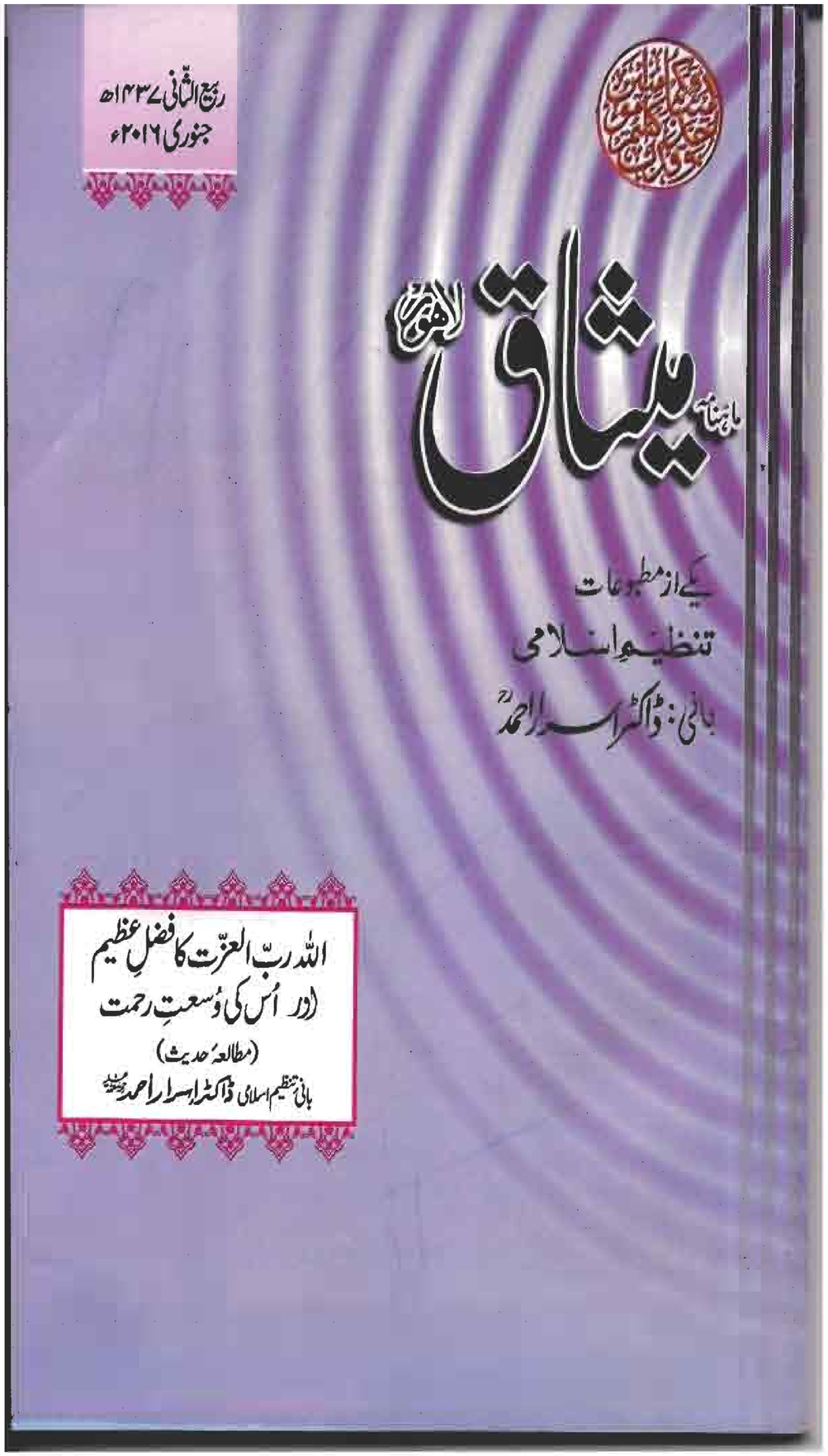

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیمِ اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار أحمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(بارھواں ایڈیشن) ———— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(دسواں ایڈیشن) ———— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(ساتواں ایڈیشن) ———— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چھٹا ایڈیشن) ———— صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مریَم تا سُورۃُ السّجدۃ
(پانچواں ایڈیشن) ———— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
(چوتھا ایڈیشن) ———— صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس
(دوسرا ایڈیشن) ———— صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 65

شمارہ : 1

ربیع الثانی 1437ھ

جنوری 2016ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - لبرل ازم، سقوطِ ڈھاکہ اور پاکستان کا مستقبل — ادارہ
- **بیانُ القُرآن** — 11
  - سورۃ المؤمنون (آیات ۵۱ تا ۱۱۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 30
  - اللہ ربّ العزت کا فضلِ عظیم اور اُس کی وسعتِ رحمت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تذکّر و تدبّر** — 47
  - قرآن کریم کی اصولی باتیں (۵) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل
- **دعوت و تحریک** — 54
  - تحریکی جِدّوجُہد اور معاشی تفاوت — حافظ سید اسامہ علی
- **دعوتِ فکر** — 69
  - کامیابی کُل کے کُل دین میں ہے! — ڈاکٹر ضمیر اختر خان
- **یادِ رفتگاں** — 75
  - حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۳) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان
- **سبق پھر پڑھ** — 87
  - خلافتِ راشدہ کے بعد سے سقوطِ خلافت تک — شجاع الدین شیخ

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

لبرل ازم‘ سقوطِ ڈھاکہ اور پاکستان کا مستقبل

تقسیم ہند سے قبل مسلمانانِ برصغیر کی قوت کا شیرازہ مختلف قبائل‘ جاگیروں‘ نسلی ولسانی بٹواروں پر مشتمل ریاستوں‘ راجواڑوں‘ جماعتوں اور فرقوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا۔ اس بکھری ہوئی منتشر قوم کو ایک لڑی میں پرو کر باہم متحد و منظّم کرنے میں جو واحد نظریہ کارفرما تھا‘ وہ تھا کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ۔ یہی وہ واحد جذبہ تھا جس کی بدولت چٹاگانگ سے لے کر درۂ خیبر تک اور بحیرۂ عرب کے ساحل سے لے کر کوہِ ہمالیہ کے دامن میں پھیلی وادیوں تک مختلف قبائل‘ برادریوں‘ راجواڑوں‘ گروہوں اور فرقوں میں منقسم مسلمان آپس میں نہ مٹنے والے اختلافات بھلا کر اور نسلی‘ لسانی‘ علاقائی اور ثقافتی تفاخر اور منافرتیں مٹا کر باہم شیر وشکر ہو گئے‘ جس کے نتیجے میں عظیم مملکت پاکستان معرضِ وجود میں آ گئی۔

اس نوزائیدہ مملکت کو ہندوستان کی سرزمین پر اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے نظریۂ پاکستان کے فروغ کی اس سے کہیں زیادہ اشد ضرورت تھی جتنی کہ اس کے قیام کے لیے‘ کیونکہ نظریہ ہی ہندو اور مسلمانوں میں بنیادی فرق اور پاکستان کی بنیاد تھی۔ اگر نظریہ کو درمیان سے نکال دیا جائے تو بھارت اور پاکستان کے درمیان سرحد بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکار ہندو نے کمال عیّاری سے دو قومی نظریہ کی دیوار میں دراڑیں ڈالنے کے لیے شروع دن سے ہی پُرفریب حربے استعمال کیے۔ کبھی ’’ہندو مسلم ایک قوم‘‘ کے نعرے لگائے گئے تو کبھی مسلمانوں میں زبان‘ کلچر‘ رنگ ونسل کا زہر بھرنے کی کوشش کی گئی اور کہیں علاقائی منافرتیں بیدار کرنے کے لیے نیشنل ازم کو اُجاگر کیا گیا۔ ہندوؤں کے ان تمام مکروہ ہتھکنڈوں کے جواب میں اشد ضرورت اس امر کی تھی کہ قیامِ پاکستان کے بعد سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر نظریۂ پاکستان کو فروغ دیا جاتا اور قومی معاشرت کی بنیاد خالصتاً اسلامی تہذیب‘ تشخص‘ روایات اور طرزِ زندگی پر رکھی جاتی۔ مدرسوں‘ سکولوں‘ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ترجیحی بنیادوں پر اسلامی تشخص کو اُبھارا جاتا۔ دورِ جاہلیت کی لسانی‘ علاقائی‘ ثقافتی عصبیتوں اور

منافرتوں کا قلع قمع اسلام کے سنہری اصولوں اخوت‘ مساوات اور عدل وانصاف کے ذریعے کیا جاتا۔ آئین‘ سیاست‘ معاشرت‘ معیشت‘ تعلیم‘ عدلیہ‘ میڈیا سمیت ہر شعبے اور ہر ادارے میں ہر سطح پر بنیادی نظریہ کے مطابق اسلامائزیشن کا عمل اولین ترجیح قرار دیا جاتا۔ یوں قومی یکجہتی وہم آہنگی کی ایسی فضا قائم ہو جاتی کہ جس میں رنگ‘ نسل‘ زبان‘ کلچر‘ سندھی‘ بلوچی‘ پٹھان‘ پنجابی‘ بنگالی اور ہر طرح کی تقسیم وتفریق ایک قومی دھارے میں شامل ہو کر ختم ہو جاتی!!

بانیٔ پاکستان اور مصورِ پاکستان کے ارشادات وفرمودات بھی پاکستان میں ہر ادارے اور ہر شعبہ میں ہر سطح پر اسلامائزیشن کے حوالے سے واضح اور اظہر من الشّمس ہیں اور بلاشبہ تحریک پاکستان میں کروڑوں مسلمانوں کی بے مثال قربانیاں‘ ہجرتیں‘ بے انتہا صعوبتیں اور اذیتیں بھی ایک مکمل اسلامی نظام کے قیام کی غماز ہیں‘ لیکن بعد کے سیاستدانوں اور حکمرانوں نے اسلامائزیشن کے اس اہم اور اولین فرض کو صرف بیانات کی حد تک محدود رکھا اور اسلام کے نعرے کو ایوانِ اقتدار میں داخل ہونے کے لیے بطورِ زینہ استعمال کیا‘ جبکہ عملی طور پر جو کچھ بھی کیا وہ لبرل اور سیکولر سوچ کا عکاس ہے۔ ان آزاد خیال‘ روشن خیال اور لبرل سیاستدانوں اور حکمرانوں نے اپنے طرزِ عمل سے پاکستان کے ہر ادارے اور ہر شعبے میں لبرل سوچ کو پروان چڑھایا۔ نتیجہ میں اسلام‘ نظریۂ پاکستان اور قیامِ پاکستان کا اصل مقصد عوام وخواص کے فہم وشعور سے محو ہوتا چلا گیا اور بھانت بھانت کے تصورات اور نظریات پروان چڑھتے گئے‘ اسلامی معاشرت کی بجائے مغربی کلچر اپنی تمام تر آزاد خیالیوں کے ہمراہ غالب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بھٹو دور تک محافل شراب وکباب‘ رقص وموسیقی ایوانِ اقتدار کا اسٹیٹس بن گیا (جو کہ طبقہ اشرافیہ میں اب تک ہے)۔ عبادات اور رسومات میں ہندو رسوم ورواج بدستور اثر پذیر رہے۔ آئین بدستور ۱۹۳۵ء کا انگریز کا بنایا ہوا اب تک چل رہا ہے‘ اس میں اسلامائزیشن کے عمل کی بجائے‘ اسلامی دفعات کی تحلیل وترمیم کو ترجیح دی گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اگر سیاست کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جاتی تو پاکستان کبھی نہ ٹوٹتا۔ مگر جیسا کہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے‘ تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

وہ قوم جو چٹاگانگ سے لے کر درّۂ خیبر تک اسلام کی بنیاد پر باہم متحد ومنظّم تھی‘ لبرل سوچ کے حامل حکمرانوں اور سیاستدانوں کے طرزِ عمل اور باہمی رسّہ کشی کے نتیجے میں پارٹی

بازی اور تفرقہ بازی کا شکار ہو کر باہم دست و گریباں ہو گئی۔ جس سیاستدان کو اقتدار میں جگہ نہ ملی اس نے ایک نئی جماعت بنا ڈالی اور اس کو برسر اقتدار لانے کے لیے بسا اوقات بھارت جیسے ازلی دشمن کی پشتیبانی حاصل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ سہروردی اور شیخ مجیب کی عوامی لیگ، جگتو فرنٹ اور دیگر کئی سیاسی پارٹیاں اس کی مثال ہیں۔ چنانچہ اس پارٹی بازی اور بھانت بھانت کے نظریات و تصورات کے نتیجے میں قومی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور ملی یکجہتی کا جنازہ اُٹھ گیا۔ یہ لبرل طرزِ سیاست ہی تھی جس نے مشرقی پاکستان کے سوا کروڑ ہندوؤں کو تیس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں کرنے کا موقع دیا۔ لبرل سیاست کے نتیجے میں کانگریس مشرقی پاکستان میں ایسے ہی متحرک تھی جیسا کہ قیام پاکستان سے پہلے۔ بعد ازاں یہی ہندو مجیب الرحمٰن کی ''عوامی مسلم لیگ'' میں شامل ہو گئے اور انہوں نے لفظ ''مسلم'' نکال کر اس کا نام ''نیشنل عوامی لیگ'' رکھ لیا۔ اسی عوامی لیگ نے پاکستانی قوم کے ملی اتحاد میں پہلا سوراخ بنگالی زبان کے نام پر کیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ایک ہندو رکن نے اسمبلی میں بنگالی زبان کو قومی زبان قرار دینے کی قرارداد پیش کی اور اس وقت کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو اپنے بہت سے مطالبات منظور کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان ہندوؤں نے مشرقی پاکستان میں معاشی عدم استحکام اور عدم مساوات کا نعرہ بلند کیا اور پاکستان کو توڑنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ امریکی دانشور رش بروک ولیمز نے ۱۹۷۰ء میں عوامی لیگ کی انتخابی مہم کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس قدر وسیع اور جنگی مہم کثیر سرمایہ اور اخراجات کے بغیر ممکن نہ تھی اور یہ سرمایہ اس جماعت اور قائدین کو ہندوؤں نے فراہم کیا تھا، کیونکہ اس کا پروگرام اس کمیونٹی کے لیے قابلِ قبول تھا''۔ اس کی بجائے پاکستانی سیاست کی بنیاد اگر اسلامی اصولوں پر رکھی جاتی تو یقیناً ہندو اقلیت کو مسلم اکثریت کی تقدیر کا اس قدر بھیانک فیصلہ کرنے کا موقع ہرگز نہ ملتا۔

کسی بھی قوم کی تعمیر اور فکری و نظریاتی نشو و نما میں تعلیم کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ضروری تھا کہ شعبہ تعلیم کو بھی اسلامی نظریات سے ہم آہنگ کیا جاتا لیکن لبرل ذہنیت کے غلبہ نے حکمرانوں کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دی۔ نتیجہ میں نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم بدستور وہی رہا جو انگریز نے چھوڑا تھا۔ مشرقی پاکستان کے ۱۳۰۰ ہائی سکولوں اور ۴۷ کالجوں کے ۹۵ فیصد ہندو مالک تھے، جن کے کمروں میں قائداعظم محمد علی جناح کی بجائے گاندھی اور نہرو کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور اور اس سے ملحقہ کالجوں

اور صوبہ بھر کے سکولوں میں درس و تدریس پر مامور ہندو اساتذہ نے اپنے بیوی بچے کلکتہ اور دیگر بھارتی شہروں میں بھیج دیے تھے اور خود پاکستان کو توڑنے کے مشن پر گامزن تھے۔ ان ہندو اساتذہ نے مسلمان طالب علموں کی برین واشنگ اس طرح سے کی کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت ہندوؤں کے دامِ فریب میں آ گئی۔

غرض ہر شعبۂ زندگی اور ہر ادارے میں اسلامی فکر کی بجائے لبرل سوچ غالب آ گئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں تعینات پاکستانی عملہ کے متعلق لارنس زائرنگ اپنی کتاب Pakistan, The Enigma of Development میں لکھتا ہے:

''چار سو سول افسران (سی ایس پی) ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے۔ معاشرے اور عوام میں ناراضگی ان افسروں کی کارکردگی پر نہیں بلکہ رویے پر تھی۔ سی ایس پی افسران پر نوآبادیاتی ذہنیت رکھنے اور گورے انگریز سے بڑھ کر تحکمانہ انداز اختیار کرنے کا الزام تھا۔''

لبرل بیوروکریسی کا طرز رہن سہن، لباس، چال ڈھال اور زبان تک انگریزوں والی تھی۔ الطاف گوہر نے ہفت روزہ ''صحافت'' ۲۱ دسمبر ۱۹۷۷ء میں لکھا:

''مغربی پاکستان والے اُردو زبان کا ذکر تو بہت کرتے تھے مگر بولتے تھے صرف انگریزی، جبکہ بنگالی انگریزی بولنے سے گھبراتے تھے۔ ہندوؤں نے اس فرق کا فائدہ اُٹھا کر بنگالیوں کے ساتھ زبان و ثقافت میں مماثلت کی بنا پر اپنا اشتراکِ عمل بڑھا لیا۔ رہ گیا اسلام کا ناطہ تو وہ ہوا میں تو برقرار نہ رہ سکتا تھا۔ جب زندگی کے کسی شعبے میں کسی اسلامی قدر کا کوئی نشان نہ تھا تو دلوں میں اس کی جھلک کیونکر آتی اور ذہنوں میں کیسے سماتا۔ وہی کچہریاں لگتی تھیں، وہی جھوٹی شہادتیں، وہی جبر و استبداد کے طریقے، وہی انگریزی طرز کے الیکشن اور وہی ووٹوں کی دھاندلیاں، اسلام تو بس لفظوں کا ایک کھیل تھا۔''

اسلام کی بجائے لبرل اور سیکولر ذہنیت کے غلبہ کے نتیجے میں بانیٔ پاکستان، مصورِ پاکستان اور پاکستان کے لیے بے انتہا قربانیاں دینے والے عوام کا اسلامی فلاحی پاکستان کا خواب محض خواب بن کر رہ گیا اور نظریۂ پاکستان کی جگہ بھانت بھانت کے نظریات اور تصورات اپنی جڑیں مضبوط کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ قومی یکجہتی و ملی سلامتی کے دشمن عناصر نے پاکستانی قوم کو ایک لڑی میں پرونے والی دو قومی نظریہ کی ڈور پر ایک بار پھر رنگ و نسل، زبان، کلچر اور نیشنل ازم کی میٹھی اور کند چھریاں چلانے کا ہنر آزما ڈالا اور نتیجتاً صرف کچھ ہی عرصہ میں وحدتِ

اسلامیہ بکھر کر پارہ پارہ ہوئی' بنگال الگ ہوگیا اور ایک عظیم اور آفاقی نظریہ کی حامل قوم کو گاؤ ماتا کی پجارن اور مشرکہ عورت کے یہ زہر آلود الفاظ سننے پڑے کہ ہم نے ''دوقومی نظریہ کو خلیج بنگال کی لہروں کی نذر کر دیا ہے۔''

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بدترین دشمن کے یہ تند و تلخ نشتر ہمیں صرف اور صرف پاکستانی حکمرانوں کے لبرل طرزِ فکر و عمل کی وجہ سے سہنے پڑے؟—— کیا یہ لبرل ازم نہیں تھا جس کی وجہ سے دوقومی نظریہ اور اسلامی تصورِ سیاست کو پس پشت ڈال دیا گیا؟ کیا یہ لبرل ازم نہیں تھا جس کی وجہ سے ملک میں اسلام اور دوقومی نظریہ سے متصادم اور متضاد نظریات اور تصورات پروان چڑھے؟ کیا اسی لبرل ازم کی وجہ سے ملک میں مغربی و ہندوستانی کلچر' نیشنل ازم' کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کو فروغ نہیں ملا؟ کیا یہ لبرل ازم کا شاخسانہ نہیں ہے کہ قوم نے اسلامی نظامِ زندگی کا تصور بھلا کر نسلی' لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر مہاجر' پشتون' سندھی' بلوچی اور بنگالیوں کے حقوق کی جنگ لڑنا شروع کر دی؟

ماضی کے ان زخموں اور تلخیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے آج ہمارے حکمران اعلانیہ اور فخریہ یہ کہتے ہیں کہ ''قوم کا مستقبل لبرل پاکستان سے وابستہ ہے'' اور عملی طور پر اس کا ثبوت ہولی و دیوالی کی ہندوانہ رسموں میں شریک ہو کر کیا جاتا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ متصور ہوگا کہ بھارت اور کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی جا رہی ہے آپ اس میں بھی شریک ہیں۔ کشمیر میں آج بھی پاکستانی پرچم لہرایا جاتا ہے اور ایسا صرف اسلام کے رشتے کی وجہ سے ہے۔ لبرل پاکستان کا تصور اور ہندو نواز پالیسیاں تحریک آزادیٔ کشمیر پر کیا اثرات مرتب کریں گی؟

نظریۂ پاکستان ہی وہ واحد جذبہ متحرکہ ہے جو بحیرۂ عرب کے ساحل سے لے کر سیاچین کے گلیشئرز تک محاذوں پر ڈٹے ہوئے جاں نثار سپاہیوں کے حوصلے اور مورال کو بلند رکھتا ہے۔ اپنی بنیاد سے انحراف کرتے ہوئے لبرل پاکستان کا تصور اور دشمن کی ہولی و دیوالی کی رسموں میں شرکت وطن کے ان جاں نثار سپاہیوں کے حوصلے اور مورال پر کیا اثرات ڈالیں گے؟

پاکستان محض ایک ریاست کا نہیں بلکہ ایک طویل تاریخ کا نام ہے' جسے ۷۱۱ء میں محمد بن قاسمؒ کے ساتھ آنے والے عرب مجاہدوں' سلطان محمود غزنویؒ کے ہمراہ ہندوستان کے طلسم کدوں اور سومنات جیسے بت کدوں سے کفر و شرک کا آخری حصار توڑنے کے لیے شہادت پانے والے اور شہاب الدین غوریؒ' شاہ اسماعیل شہیدؒ و سید احمد شہیدؒ اور اسلام کے

جاں نثار سپاہیوں نے اپنے خون سے رقم کیا ہے۔ لبرل پاکستان کا تصور پاکستان کی اس سنہری تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ نیز یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا قیامِ پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والوں کی منزل لبرل پاکستان تھا؟ کیا لبرل پاکستان کا تصور ان شہیدوں کی روحوں سے غداری نہیں ہے؟

آج لبرل نظریات کا حامل طبقہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تاریخ کے نام پر پڑھایا جانے والا نصاب زہر آلود اور نفرت پر مبنی ہے' لہٰذا اسے تبدیل کیا جائے۔ یعنی صاف الفاظ میں بھارت سے دوستی کا تقاضا ہے کہ اپنی تاریخ اور نظریات کو بھلا دیا جائے۔ جبکہ دوسری طرف بھارت تو کٹر ہندو ریاست بن چکا ہے۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں جب کہ ملک میں پہلے ہی انارکی فضا ہے' بھارت سمیت ملک دشمن اور اسلام دشمن عناصر ملکی سلامتی اور قومی یکجہتی کے خلاف زبان' نسل' کلچر' علاقائیت اور صوبائیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہاں ہیں' بلوچستان' قبائلی علاقوں اور کراچی میں انہی بنیادوں پر تخریب کاری ہو رہی ہے' لبرل پاکستان کا حکومتی تصور پاکستان دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے اور ملک میں مزید نظریاتی انتشار اور تفریق و تقسیم کا باعث ثابت ہوگا۔ ان حالات میں قوم کو نظریاتی ہم آہنگی اور ملی یکجہتی کی ضرورت ہے اور وہ صرف اپنے بنیادی نظریہ سے جڑنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اپنی بنیاد سے ہٹ کر کوئی بھی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ سقوطِ ڈھاکہ جیسے سانحات کے علاوہ نہیں نکلے گا۔ ع

حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ المُؤمِنُون

آیات ۵۱ تا ۷۷

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
عَلِیْمٌ ﴿۵۱﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْۤا
اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِیْ
غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۵۴﴾ اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۵۵﴾
نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ
رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ
بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى
رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَا
نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَیْنَا كِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾
بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِیْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا
عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا
تَجْـَٔرُوا الْیَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ فَكُنْتُمْ
عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِیْنَ ۖ۫ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا
الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ
فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ

لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ
تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَیْرٌ ۚ وَّهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ
لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ
طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ
وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ
فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾

آیت ۵۱ ﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ﴾ ’’اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔‘‘

﴿اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۵۱﴾﴾ ’’جو کچھ تم کرتے ہو یقیناً میں اس سے باخبر ہوں۔‘‘

آیت ۵۲ ﴿وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ’’اور یقیناً یہ تمہاری اُمت ایک ہی اُمت ہے‘‘

تمام پیغمبروں کا تعلق ایک ہی امت یا جماعت سے ہے۔ بعض روایات کے مطابق انبیاء و رسل علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ان میں سے تین سو تیرہ رسولؑ ہیں اور باقی انبیاءؑ۔ ان انبیاءؑ و رسلؑ میں سے بعض کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے جبکہ اکثر کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ سورۃ النساء‘ آیت ۱۶۴ میں اس بارے میں یوں وضاحت فرمائی گئی ہے: ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ ؕ﴾ ’’اور (بھیجے) وہ رسولؑ جن کا ہم اس سے پہلے آپؐ کے سامنے تذکرہ کر چکے ہیں‘ اور ایسے رسول بھی جن کے حالات ہم نے آپؐ کے سامنے بیان نہیں کیے۔‘‘

﴿وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾﴾ ’’اور میں تمہارا رب ہوں‘ بس تم میرا ہی تقویٰ اختیار کرو!‘‘

آیت ۵۳ ﴿فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ﴾ ’’لیکن لوگوں نے اپنے معاملے کو اپنے مابین تقسیم کر لیا ٹکڑے کر کے۔‘‘

اَمر سے یہاں مراد ’’دین‘‘ ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا‘ اور وہ

یہودیت‘ عیسائیت وغیرہ ناموں پر مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔

﴿كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳﴾ ’’ہر گروہ کے لوگ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر اِترا رہے ہیں۔‘‘

آیت ۵۴ ﴿فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۵۴﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ انہیں چھوڑ دیجیے ان کی مدہوشی میں‘ ایک وقت تک کے لیے۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵﴾ ’’کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال اور بیٹوں سے مدد دیے جا رہے ہیں۔‘‘

آیت ۵۶ ﴿نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶﴾ ’’تو ہم ان کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں؟ (ایسا ہرگز نہیں!) لیکن یہ لوگ جانتے نہیں۔‘‘

ہماری طرف سے اپنے ان نافرمانوں کو مال و اولاد جیسی نعمتوں سے نوازتے چلے جانا ان کے ساتھ بھلائی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہی چیزیں ان کے لیے موجبِ عذاب بن جائیں گی۔ سورۃ التوبہ میں یہ فلسفہ اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۵۵﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ) آپ کو ان کے اموال اور ان کی اولاد سے تعجب نہ ہو‘ اللہ تو چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعے سے انہیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے‘ اور ان کی جانیں نکلیں اسی کفر کی حالت میں‘‘۔ اور سورۃ التوبہ ہی کی آیت ۸۵ میں الفاظ کے بہت معمولی فرق کے ساتھ یہی مضمون پھر سے دہرایا گیا ہے۔

آگے جو آیات آ رہی ہیں ان کا انداز اس سورت کی ابتدائی آیات سے مشابہ ہے۔ سورت کے آغاز میں اکثر آیات اَلَّذِيْنَ یا وَالَّذِيْنَ سے شروع ہوتی ہیں اور ان آیات میں بھی اَلَّذِيْنَ اور وَالَّذِيْنَ کی تکرار ہے۔ گویا جو مضمون آغازِ سورت میں بیان ہوا تھا یہ اس کی دوسری قسط ہے۔ وہاں پر بندۂ مؤمن کی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے درکار بنیادی خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا جبکہ یہاں پر مطلوبہ شخصیت و کردار کی پختہ (mature) خصوصیات کی جھلکیاں دکھائی جا رہی ہیں‘ جن میں زیادہ تر بندۂ مؤمن کی باطنی کیفیات کا تذکرہ ہے۔

آیت ۵۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۵۷﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو اپنے

رب کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔‘‘

آیت ۵۸ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۸﴾ ’’اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔‘‘

آیت ۵۹ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝۵۹﴾ ’’اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔‘‘

شرک کے ردّ اور ابطال کے ضمن میں قرآن حکیم میں بہت تکرار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملے کو بار بار سمجھنے کی ضرورت ہے۔ شرک کی اہم اور واضح صورتوں کے بارے میں تو سب جانتے ہیں اور اجتناب بھی کرتے ہیں‘ لیکن اس کی بہت سی مخفی صورتیں بھی ہیں جو ہر دور میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں ☆۔ لہٰذا ایک بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرک کی مہلک بیماری کے بارے میں اپنے اندر باریک بینی اور دقت نظری کی ایسی صلاحیت پیدا کر لے جس کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے: ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من اندازِ قدت را می شناسم!

(تو جس انداز کا چاہے لباس زیب تن کر لے‘ میں تجھے تمہارے قد کے انداز سے پہچان لیتا ہوں۔)

یعنی شرک جب بھی اس کے سامنے آئے‘ وہ جس روپ اور جس بھیس میں بھی ہو وہ اس کو پہچان لے۔

آیت ۶۰ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝۶۰﴾ ’’اور وہ جو دیتے ہیں (اللہ کی راہ میں) تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔‘‘

یعنی اللہ کی راہ میں وہ حتی المقدور صدقہ و خیرات کرتے رہتے ہیں‘ لیکن اس کے باوجود وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہتے ہیں۔ دوسروں کی مدد کرتے ہوئے وہ انہیں کمتر اور خود کو برتر نہیں سمجھتے‘ بلکہ انہیں یہ خدشہ اور اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں کسی کوتاہی‘ غلطی یا خلوص کی کمی کے باعث ان کا یہ عمل اللہ کے ہاں رد نہ کر دیا جائے۔

☆ اس حوالے سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتاب ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (مرتب)

آیت ۶۱ ﴿اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں میں کوشاں ہیں اور ان کے لیے سبقت کرنے والے ہیں۔‘‘

زندگی میں ان کی بھاگ دوڑ نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے ہوتی ہے اور اس میدان میں وہ ہمیشہ دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

آیت ۶۲ ﴿وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ’’اور ہم نہیں ذمہ دار ٹھہرائیں گے کسی جان کو مگر اُس کی استطاعت کے مطابق‘‘

یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ آیات: ۲۳۳ اور ۲۸۶، سورۃ الانعام آیت: ۱۵۲، سورۃ الاعراف آیت: ۴۲، اور سورۃ الطلاق آیت: ۷ میں یہ مضمون ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔

﴿وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ’’اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے، لہٰذا ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

اس سے مراد ہر شخص کا اعمال نامہ اور اس کی زندگی بھر کے اعمال و افعال کی جزئیات و تفصیلات پر مشتمل ریکارڈ ہے۔ اس اعمال نامے کے مطابق انسان کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک عمل کا اس کی استطاعت اور صلاحیتوں کے مطابق جائزہ لے کر اس کے لیے جزا اور سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آج کمپیوٹر کے دور میں اس تصور کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ یوں سمجھ لیں کہ انسان کے جینز (genes) کے بارے میں تمام معلومات (جبلی صلاحیتوں) اور اس کے ماحولیاتی عوامل کی تفصیلات اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سپر کمپیوٹر میں موجود ہیں۔ ماحول اور صلاحیتوں کی عطا کلی طور پر اللہ کی دین ہے، اس میں انسان کے اپنے اختیار و انتخاب کا کچھ دخل نہیں۔ جینز اور ماحولیاتی عوامل وغیرہ مل کر انسان کا ’شاکلہ‘ تشکیل دیتے ہیں۔ (شاکلہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بیان القرآن حصہ چہارم میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۴ کی تشریح۔) اللہ تعالیٰ کا سپر کمپیوٹر ہر شخص کے اعمال کو اس کی شخصیت کے شاکلہ کے ساتھ منطبق کر کے بتائے گا کہ اس کے شاکلہ میں کس عمل کے لیے کتنی استطاعت اور گنجائش تھی اور اس نے کس حد تک اس کی کوشش کی۔ اس حساب کتاب (evaluation) کے بعد یہ کمپیوٹر نتائج کا اعلان کرے گا، جس کے لیے یہاں ’’يَنْطِقُ بِالْحَقِّ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ الکہف میں اس کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ

مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾﴾ ’’اور رکھ دیا جائے گا اعمال نامہ، چنانچہ تم دیکھو گے مجرموں کو ڈرے ہوئے اس سے جو کچھ اس میں ہو گا، اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری شامت! یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو، مگر اس کو محفوظ کر کے رکھا ہے، اور جو عمل بھی انہوں نے کیا ہو گا وہ اسے اپنے سامنے موجود پائیں گے، اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔‘‘

آیت ۶۳ ﴿بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ ’’لیکن اُن کے دل اس سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں‘‘

﴿وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ’’اور ان کے اور بہت سے مشاغل ہیں ان کے سوا جن کے لیے وہ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔‘‘

اوپر اہلِ ایمان کے جن اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے مشاغل اور سرگرمیاں ان سے یکسر مختلف ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس دین کی خدمت اور بھلائی کے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ انہیں دن رات اپنی دنیا کمانے کی فکر ہے۔ وہ اپنے وقت کا کُل سرمایہ اپنی ساری توانائیوں سمیت خود ساختہ جھوٹے معیارات کو برقرار رکھنے اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے لیے کھپا رہے ہیں۔ اس آیت کے مضمون کی روشنی میں ہر شخص کو اپنی مصروفیات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس کی شبانہ روز تگ و دو اور بھاگ دوڑ کا کتنا حصہ دین کے لیے ہے اور کتنا حصہ دنیا کے لیے۔ اگر کسی شخص کی تمام تر کوشش اور ساری محنت ہے ہی دنیا کے لیے، اس کا نصب العین بھی دنیا ہے اور اس نے منصوبہ بندی بھی صرف اسی کے لیے کر رکھی ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ آخرت کی تیاری کرنے کے لیے فرصت کے لمحات اسے کب اور کیسے میسر آئیں گے؟

آیت ۶۴ ﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْــَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ’’یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چیخیں چلّائیں گے۔‘‘

آیت ۶۵ ﴿لَا تَجْــَٔرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ’’(ان سے کہا جائے گا) آج مت چیخو چلّاؤ! اب ہمارے ہاں سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔‘‘

آج تمہاری اس چیخ و پکار اور آہ و فریاد کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تمہاری فریاد سن کر آج کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔

آیت ۶۶ ﴿قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۝۶۶﴾
''میری آیات تمہیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں' تو تم اپنی ایڑیوں کے بل الٹے پلٹ جاتے تھے۔''

آیت ۶۷ ﴿مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ۝۶۷﴾ ''تکبر کرتے ہوئے' پیغمبرؐ کو قصہ گو سمجھتے ہوئے چھوڑ جاتے تھے۔''

اس زمانے میں عربوں کے ہاں قصہ گوئی کا بہت رواج تھا۔ پیشہ ور قصہ گو راتوں کو مجمع جما کر قصے سنایا کرتے تھے۔ یہ عام لوگوں کے لیے تفریح کا ذریعہ تھا اور قصہ گو کے لیے کمائی کا وسیلہ۔ اسی طرح کے قصہ گو ہندوستان میں راجپوتوں کے ہاں بھی پائے جاتے تھے جو ان کے لیے راتوں کو محفلیں سجاتے تھے۔ چنانچہ اس پس منظر میں مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ کیا تم لوگوں نے ہمارے رسول ﷺ کو بھی قصہ گو سمجھ رکھا ہے کہ آپؐ کی بات سننا یا نہ سننا تمہارے لیے برابر ہے؟ اور تم سمجھتے ہو کہ آپؐ کی بات ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ تم لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ یہ فیصلہ کن کلام ہے: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۱۰۵﴾ (بنی اسرائیل) ''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے' اور (اے نبی ﷺ) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا''۔ آئندہ اسی کلام کے ترازو میں قوموں کی قسمتیں تولی جائیں گی' اسی کے سہارے لوگ کامیاب و کامران ہوں گے اور اس کو چھوڑ کر ناکامیوں اور محرومیوں کے گڑھوں میں گریں گے۔ اس سلسلے میں نبی مکرم ﷺ کا یہ فرمان بہت واضح اور دوٹوک ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(۱) ''اللہ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو اُٹھائے گا اور اس (کو چھوڑنے) کے باعث قوموں کو گرائے گا۔''

آیت ۶۸ ﴿اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۶۸﴾
''تو کیا ان لوگوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا؟ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آ گئی ہے جو ان کے اگلے آباء و اَجداد کے پاس نہیں آئی تھی؟''

تو کیا وحی کا نازل ہونا اور رسولؐ کا من جانب اللہ مبعوث ہونا انہیں اس لیے عجیب لگ

(۱) صحيح مسلم' كتاب صلاة المسافرين وقصرها' باب فضل من يقوم بالقرآن ويعلمه.....

رہا ہے کہ ان کے باپ دادا یعنی بنو اسماعیلؑ پر اس سے پہلے کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان کی طرف اس سے پہلے کوئی نبیؑ آیا تھا؟

آیت ۶۹ ﴿اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۶۹﴾ ''کیا انہوں نے اپنے رسولؐ کو پہچانا نہیں' تو اس لیے وہ اسؐ سے مغائرت محسوس کرتے ہیں!''

آیت ۷۰ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ﴾ ''یا وہ کہتے ہیں کہ ان پر کچھ جنون کا اثر ہے!''

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ پر آسیب کا اثر ہے یا آپؐ کو جنون ہو گیا ہے۔

﴿بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝۷۰﴾ ''بلکہ وہ تو ان کے پاس حق لے کر آئے ہیں' لیکن ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرنے والی ہے۔''

آیت ۷۱ ﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ﴾ ''اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین اور جو کوئی ان کے اندر ہیں سب بگڑ جاتے۔''

اگر حق کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین و آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ حق ان لوگوں کی خواہشات کے مطابق نہیں ڈھل سکتا' بلکہ انہیں خود کو حق کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور اس کی پیروی کرنا ہوگی۔

﴿بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۷۱﴾ ''بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کی نصیحت لائے ہیں تو وہ اپنی ہی نصیحت سے اعراض کر رہے ہیں۔''

آیت ۷۲ ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۚ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۷۲﴾ ''کیا آپؐ ان سے کوئی خراج (اجر) مانگ رہے ہیں؟ تو آپؐ کے رب کا اجر بہت بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

دراصل یہاں ان الفاظ میں خطاب حضور ﷺ سے نہیں ہے بلکہ مشرکینِ مکہ سے ہے کہ عقل کے اندھو' ذرا سوچو تو! تمہارے شاعر اور قصہ گو تو تم لوگوں سے اجر و انعام چاہتے ہیں۔ مگر تم نے محمد (ﷺ) کی زبان سے کبھی ایسی کوئی بات سنی ہے؟ کبھی آپؐ نے اپنی اس خدمت کے عوض تم سے کوئی اجرت طلب کی ہے؟ ان کو تو ان کے رب کی طرف سے جو اجر و انعام ملنے والا ہے وہ پوری دنیا کے خزانوں سے بہتر ہے۔

آیت ۷۳ ﴿وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۷۳﴾ ''اور یقیناً آپؐ انہیں سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں۔''

آیت ۷۴ ﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝۷۴﴾ ''اور یقیناً جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ اس راستے سے انحراف کرتے ہیں۔''

آیت ۷۵ ﴿وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۷۵﴾ ''اور اگر ہم ان پر رحم فرمائیں اور ان کو جو تکلیف ہے وہ رفع کر دیں تو ضرور وہ بڑھتے چلے جائیں گے اپنی سرکشی میں اندھے ہو کر۔''

ان الفاظ سے یوں لگتا ہے کہ اس سورت کے نزول کے زمانہ میں اہلِ مکّہ کسی مصیبت میں گرفتار تھے۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کی اس سنّت کا ذکر گزر چکا ہے جس کے تحت ہر رسول کی بعثت کے بعد متعلقہ قوم پر چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجے جاتے تھے اور انہیں مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا کیا جاتا تھا تاکہ وہ خوابِ غفلت سے جاگیں اور ان کے ذہن حق کی دعوت پر غور و فکر کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

آیت ۷۶ ﴿وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ﴾ ''اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا تھا''

اس سے مراد شاید قحط اور خشک سالی کا وہ عذاب ہے جس میں اہل مکہ کئی سال تک مبتلا رہے اور جس کی وجہ سے ہر شخص کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

﴿فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۷۶﴾ ''تو (اس کے باوجود) نہ انہوں نے اپنے رب کے سامنے عاجزی اختیار کی اور نہ ہی وہ گڑگڑائے۔''

آیت ۷۷ ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝۷۷﴾ ''یہاں تک کہ جب ہم ان پر کھول دیں گے بہت سخت عذاب کا دروازہ، تو جبھی وہ اس میں بالکل مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔''

آیات ۷۸ تا ۹۲

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸
وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۷۹ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ

وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۸۰ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ
الْاَوَّلُوْنَ ۝۸۱ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۸۲ لَقَدْ
وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸۳ قُلْ
لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۴ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ۝۸۵ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۸۶
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۸۷ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ
يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۸ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى
تُسْحَرُوْنَ ۝۸۹ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۹۰ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا
كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ ۭ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي
بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۹۱ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ۝۹۲

آیت ۷۸ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ﴾ ''اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنائے ہیں کان، آنکھیں اور عقل۔''

﴿قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸﴾ ''بہت کم ہے جو تم شکر ادا کرتے ہو۔''

آیت ۷۹ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۷۹﴾ ''اور وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں پھیلا دیا ہے اور پھر اُسی کی طرف تم سب جمع کر دیے جاؤ گے۔''

آیت ۸۰ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ﴾ ''اور وہی ہے جو زندہ رکھتا ہے اور موت دیتا ہے، اور اُسی کا کام ہے دن رات کو بدلنا۔''

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۸۰﴾ ''تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے!''

آیت ۸۱ ﴿بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۸۱﴾ ''بلکہ انہوں نے بھی وہی کہا جو ان سے پہلے لوگوں نے کہا تھا۔''

آیت ۸۲ ﴿قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۸۲﴾ ''انہوں نے کہا تھا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہماری ہڈیاں ہی رہ جائیں

گی تو کیا ہمیں پھر اٹھا لیا جائے گا؟''

آیت ۸۳ ﴿لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ﴾ ''اسی کی دھمکی ہمیں دی جا رہی ہے اور اس سے پہلے ہمارے آباء و اَجداد کو بھی دی گئی تھی''

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸۳﴾ ''یہ کچھ بھی نہیں مگر قصے ہیں اگلے لوگوں کے۔''

آیت ۸۴ ﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۴﴾ ''آپؐ ان سے پوچھئے کہ یہ زمین اور جو اس میں ہیں سب کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو (تو بتاؤ)!''

اس سورۂ مبارکہ کا یہ آخری حصہ بہت ہی پُرجلال ہے۔ قاری محمد صدیق المنشاوی (ان کا تعلق مصر سے ہے) نے ان آیات کی تلاوت ایسے پُرسوز انداز میں کی ہے کہ اسے سنتے ہوئے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۸۵﴾ ''یہ کہیں گے کہ اللہ ہی کے ہیں! آپؐ کہیے تو کیا تم غور نہیں کرتے؟''

آیت ۸۶ ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۸۶﴾ ''آپ ان سے پوچھئے کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟''

آیت ۸۷ ﴿سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۸۷﴾ ''کہیں گے کہ (یہ سب کچھ بھی) اللہ ہی کا ہے! آپؐ کہیے تو کیا تم (اُس اللہ سے) ڈرتے نہیں؟''

تم لوگ اللہ کو اس دنیا و مافیہا کا خالق بھی مانتے ہو اور اسے عرش و فرش کا مالک بھی تسلیم کرتے ہو' لیکن اس کے ساتھ بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو اس کا شریک بھی بناتے ہو! کیا تمہیں یہ جسارت کرتے ہوئے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوتا؟

آیت ۸۸ ﴿قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۸﴾ ''ان سے یہ بھی پوچھئے کہ کون ہے وہ جس کے ہاتھ میں اختیار ہے ہر چیز کا؟ اور جو پناہ دیتا ہے اور جس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی؟ اگر تم جانتے ہو (تو بتاؤ)!''

آیت ۸۹ ﴿سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝۸۹﴾ ''یہ کہیں گے کہ (یہ شان تو) اللہ ہی کی ہے! آپؐ کہیے کہ پھر کہاں سے تم پر جادو ہو جاتا ہے؟''

یہ کون سا جادو اور فریب ہے جس کے اثر سے تم لوگ یہ سب کچھ تسلیم کر کے پھر شرک پر آمادہ ہو جاتے ہو؟

آیت ۹۰ ﴿بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۹۰﴾ ''بلکہ ہم تو ان کے پاس حق لے آئے ہیں لیکن یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔''

آیت ۹۱ ﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ﴾ ''اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے''

﴿اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ﴾ ''(اگر ایسا ہوتا) تب تو ہر معبود اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔''

﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۹۱﴾ ''اللہ پاک ہے اس سے جو یہ بیان کر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ لوگ جس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ ان سے پاک اور بہت ارفع و اعلیٰ و منزّہ ہے۔

آیت ۹۲ ﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۹۲﴾ ''وہ جاننے والا ہے ہر غیب اور ظاہر کا' چنانچہ وہ بہت بلند ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

آیات ۹۳ تا ۱۱۸

﴿قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝۹۳ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۹۴ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝۹۵ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝۹۶ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝۹۹ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ ۝۱۰۱ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۲

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ
خٰلِدُوْنَ ۝ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ
تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا
قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ قَالَ
اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا
حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ۝ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا
صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ
سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ
لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا
وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ
الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا
حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ
وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

آیت ۹۳ ﴿قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝۹۳﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ دعا کیجیے: اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ (عذاب) دکھائے جس کی انہیں دھمکی جا رہی ہے۔‘‘

آیت ۹۴ ﴿رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۹۴﴾ ’’تو پروردگار! مجھے ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا۔‘‘

جس عذاب کی وعیدیں ان لوگوں کو دی جا رہی ہیں اگر وہ میری نگاہوں کے سامنے ان پر آ گیا تو اے میرے پروردگار! مجھے اس سے اپنی پناہ میں رکھنا۔ گویا ہر شخص کو اللہ کے ایسے عذاب سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں سورۃ الانفال کی اس آیت کا مضمون لرزا دینے والا ہے: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

الْعِقَابِ ۝۲۵﴾ ’’اور ڈرو اس عذاب سے کہ وہ (جب آئے گا تو) تم میں سے صرف گنہگاروں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا‘ اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے‘‘۔ پاکستان کے خصوصی حالات کے پیش نظر ہم سب کو ایسی تنبیہات کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا۔ چنانچہ یہاں پر شریعت اسلامی کا عملی نفاذ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو مہلت عمل ہمیں دے رکھی ہے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک کو اس سرزمین پر اقامت دین کی کوشش کے لیے کمر ہمت باندھ لینی چاہیے۔ اس فرض کی ادائیگی سے غفلت کی پاداش میں عذابِ الٰہی کا ایک کوڑا ہم پر ۱۹۷۱ء میں پڑ چکا ہے۔ اب اس سے پہلے کہ ہماری مہلت عمل ختم ہو جائے اور ہم دوسرے کوڑے کی زد میں آ جائیں ہمیں اپنے تن من اور دھن کو قربان کر دینے کے جذبے کے ساتھ اس میدان میں نکلنا ہوگا۔ ہمارے لیے اللہ کی پکڑ سے بچنے اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہونے کا یہی ایک راستہ ہے۔

آیت ۹۵ ﴿وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝۹۵﴾ ’’اور یقیناً ہم آپؐ کو وہ دکھا دینے پر قادر ہیں جس (عذاب) کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں۔‘‘

آیت ۹۶ ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ﴾ ’’آپؐ مقابلہ کیجیے برائی کا اچھائی کے ساتھ۔‘‘

آپؐ ان کی شرارتوں سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کریں۔ ان لوگوں کا آپؐ کے ساتھ جیسا بھی رویہ ہو مگر آپؐ کو اس کا مقابلہ نیکی اور بھلائی سے ہی کرنا ہے۔ چنانچہ آپؐ ان کی گالیوں کے جواب میں انہیں دعا دیں اور ان کے برا بھلا کہنے کے باوجود آپؐ اس کو اللہ کی طرف بلاتے رہیں۔

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝۹۶﴾ ’’ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔‘‘

جو کچھ یہ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں ہم اس سے خوب واقف ہیں۔

آیت ۹۷ ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷﴾ ’’اور کہیے کہ اے میرے رب! میں تیری پناہ میں آتا ہوں شیاطین کی چھوت سے۔‘‘

آیت ۹۸ ﴿وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾﴾ ''اور اے میرے رب! میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

ایک داعی کے لیے شیطان کی چھوت اور اُکساہٹ کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اسے اپنی دعوتی کوششوں کے دوران اپنے مخاطبین پر غصہ آ جائے اور وہ انہیں حق کی طرف مائل کرنے کے بجائے متنفر کر دے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۰ میں بھی ایسی ہی صورت حال سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

آیت ۹۹ ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾﴾ ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا: پروردگار! مجھے ذرا واپس بھیج دے۔''

آیت ۱۰۰ ﴿لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ﴾ ''تاکہ جو کچھ میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں نیک کام کروں۔ ہرگز نہیں!''

اے میرے پروردگار! اب اگر تو مجھے واپس دنیا میں بھیج دے تو میں اپنے مال و اسباب کو تیرے راستے میں اور تیرے دین کی خدمت میں لٹا دوں گا!

﴿اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ﴾ ''یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہے گا۔''

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''اور اب ان کے پیچھے ایک برزخ حائل ہے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے۔''

موت کے بعد تو اب بعث بعد الموت تک ان کے لیے عالم برزخ کی زندگی ہے۔

آیت ۱۰۱ ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''پھر جب صُور میں پھونک ماری جائے گی تو اُس دن ان میں کوئی نسبی تعلق نہیں رہے گا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔''

اُس دن ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوگا: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾﴾ (عبس) ''جس دن انسان بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ جس دن ان میں سے ہر شخص کی ایسی حالت

ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا کر دے گی۔''

آیت ۱۰۲ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''تو جن کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔''

یہ وہ خوش نصیب لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیوی زندگی میں واقعتاً اپنی شخصیت کو اپنی روح کے فطری تقاضوں کے مطابق پروان چڑھایا تھا اور اپنی خودی اور سیرت کی تعمیر بھی انہی پاکیزہ بنیادوں پر کی تھی۔

آیت ۱۰۳ ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِىْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾ ''اور جن کے (نیک اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی ہوں گے جنہوں نے خود کو ہلاکت میں ڈالا، وہ جہنم میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

آیت ۱۰۴ ﴿تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ ''آگ ان کے چہروں کو جھلسا دے گی اور وہ اس کے اندر بدشکل ہو جائیں گے۔''

چہروں کے جھلس جانے کے باعث ان کی شکلیں بگڑ جائیں گی۔

آیت ۱۰۵ ﴿اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ ''(ان سے کہا جائے گا) کیا میری آیات تمہیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں، تو تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے!''

آیت ۱۰۶ ﴿قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ ''وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی تھی اور (ہم تسلیم کرتے ہیں کہ) ہم گمراہ لوگ تھے!''

آیت ۱۰۷ ﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''اے ہمارے پروردگار! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال دے، اگر ہم دوبارہ یہی کریں تو پھر ہم واقعی ظالم ہوں گے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾﴾ ''اللہ فرمائے گا: اب تم ذلیل و خوار ہو کر اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو!''

آیت ۱۰۹ ﴿اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِىْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ

خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ’’یقیناً میرے بندوں میں کچھ وہ لوگ بھی تھے جو کہا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں‘ بس تُو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما‘ اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

آیت ۱۱۰ ﴿فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا﴾ ’’تو تم نے ان کا مذاق اڑایا تھا‘‘

میرے وہ بندے جب مجھ سے گڑگڑا کر دعا کرتے تھے تو تم ان پر ہنسا کرتے تھے۔

﴿حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ﴾ ’’یہاں تک کہ ان لوگوں (کا تمسخر اڑانے کی مصروفیت) نے تمہیں میرا ذکر بھلا دیا‘‘

﴿وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾ ’’اور تم ان پر ہنستے ہی رہتے۔‘‘

تم لوگ میرے بندوں کی تضحیک کرنے اور ان کا مذاق اڑانے میں ایسے مگن رہے کہ میں تمہیں بالکل ہی یاد نہ رہا۔

آیت ۱۱۱ ﴿اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ ’’آج میں نے ان کو بدلہ دیا ہے ان کے صبر کے طفیل‘ کہ آج یقیناً وہی کامیاب ہیں۔‘‘

آیت ۱۱۲ ﴿قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ’’(پھر) وہ ان سے پوچھے گا کہ تم لوگ کتنا عرصہ زمین میں رہے ہو‘ سالوں کی گنتی میں؟‘‘

آیت ۱۱۳ ﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَاۗدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ ’’وہ کہیں گے کہ ہم تو رہے ہیں (وہاں) بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ‘ تو آپ پوچھ لیں حساب کتاب والوں سے۔‘‘

آیت ۱۱۴ ﴿قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ’’اللہ فرمائے گا کہ (واقعتاً) تم لوگ نہیں رہے ہو مگر بہت تھوڑا ہی عرصہ‘ کاش کہ تم لوگ جانتے ہوتے!‘‘

آیت ۸۴ سے شروع ہونے والے سلسلۂ کلام میں یہ آخری چار آیات خصوصی طور پر بہت جامع اور پُرجلال ہیں۔ جیسا کہ آیت ۸۴ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سورت کے اس حصے کی تلاوت قاری محمد صدیق المنشاوی نے بہت پُرتاثیر انداز میں کی ہے۔ ان کی یہ تلاوت سننے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے سننے سے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے:

آیت ۱۱۵ ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ’’کیا تم

نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟‘‘

گزشتہ آیات کے سیاق وسباق میں اس آیت کا ترجمہ صیغہ ماضی میں ہوگا اور اس مفہوم میں اس کے مخاطب وہی جہنمی لوگ ہوں گے جن کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اور اگر اسے گزشتہ سلسلہ کلام سے علیحدہ پڑھا جائے تو اس کا ترجمہ صیغہ حال میں کیا جائے گا اور پھر اس کا مخاطب ہر پڑھنے سننے والا اور دنیا کے ہر زمانے کا ہر انسان ہوگا کہ اے لوگو! کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد اور بیکار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہمارے پاس واپس آ کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب نہیں دینا ہے؟

عقلی اور منطقی طور پر یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آخرت کے تصور کے بغیر انسانی تخلیق کا مقصد سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اگر انسان عام حیوانات جیسا حیوان ہوتا تو پھر واقعی حیات بعد الممات اور آخرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی‘ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حیوانات کے برعکس انسان کے اندر فطری طور پر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی تمیز (moral sense) پیدا کی گئی ہے۔ اس اخلاقی حس کے نتیجے میں انسانی سطح پر جو اخلاقی اقدار (moral values) وجود میں آئی ہیں وہ کسی قوم‘ کسی علاقے یا زمانے تک محدود نہیں‘ بلکہ مستقل (permanent) اور آفاقی (universal) ہیں۔ چنانچہ ’’گندم از گندم بروید جو ز جو‘‘ (گندم سے گندم اُگتی ہے اور جو سے جو) کے اصول کے مطابق اچھائی کا نتیجہ اچھا نکلنا چاہیے اور برائی کا برا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ لازمی طور پر ایسا نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ صورت حال منطقی طور پر تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا وجود میں آئے‘ جہاں ہر انسان کی موجودہ زندگی کے ایک ایک فعل اور ایک ایک عمل کا احتساب کر کے مصدقہ آفاقی اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا اہتمام ہو۔ یہی نکتہ ہے جسے قرآن مجید مختلف مواقع پر ایمان بالآخرت کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ بہرحال ایک ذی شعور انسان بالآخر اس منطقی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ (آل عمران) ’’اے ہمارے پروردگار! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا‘ تُو پاک ہے‘ پس تُو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے!‘‘

آیت ۱۱۶ ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ﴾ ’’تو بہت بلند و بالا ہے اللہ‘ جو حقیقی

بادشاہ ہے۔‘‘

اللہ اس کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے۔ وہ کلی اختیارات کا مالک ہے اور اس کی یہ حیثیت بھی سزا و جزا کے نظام کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں جو اپنے غداروں اور باغیوں کو سزا نہ دے اور وفاداروں کو انعام واکرام اور خلعتوں سے نہ نوازے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ بادشاہِ حقیقی اپنے جاں نثاروں کی قدر افزائی نہ کرے‘ ان کی قربانیوں کا انہیں کوئی صلہ نہ دے اور اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو سزا نہ دے؟

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾﴾ ’’اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہ بہت عزّت والے عرش کا مالک ہے۔‘‘

آیت ۱۱۷ ﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ﴾ ’’اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو‘‘

یعنی اللہ کو بھی معبود مانتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کسی اور کو بھی پکارتا ہے۔

﴿لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ﴾ ’’جس کے بارے میں اس کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔‘‘

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾ ’’اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے کافر فلاح نہیں پائیں گے۔‘‘

آیت ۱۱۸ ﴿وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾ ’’اور دعا کیجیے کہ پروردگار! تُو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما‘ اور تو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔‘‘

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

اللہ ربّ العزت کا فضلِ عظیم اور اُس کی وسعتِ رحمت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۱۸ جولائی ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾﴾ (الانعام)

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾﴾ (القصص)

﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾﴾ (المؤمن)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ' عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْمَا يَرْوِىْ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ قَالَ :

((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ —— فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً ، فَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ ، وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً ، وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً))[۱]

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب من ھم بحسنة او بسیئة۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان ' باب اذا ھم العبد بحسنة کتبت واذا ھم بسیئة لم تکتب۔

سیدنا ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے اور رسول اللہ ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں اور پھر اس کو واضح بھی کر دیا ہے — کوئی شخص نیکی کا ارادہ کرے اور ابھی اس نے اس پر عمل نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں مکمل نیکی درج فرمالیتا ہے۔ اور اگر نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس ایک نیکی کو اپنے ہاں دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ لکھ لیتا ہے۔ اور اگر انسان برائی کا صرف ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو بھی اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں مکمل نیکی لکھ لیتا ہے۔ اور اگر برائی کا ارادہ کر کے عمل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اسے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے۔''

معزز سامعین کرام!

اربعین نووی کی حدیث نمبر ۳۷ کا آج ہم نے مطالعہ کرنا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و رأفت کی عظیم ترین مظہر ہے اور یہی مضمون قرآن مجید میں بھی کئی جگہ بیان ہوا ہے۔

نیکی کا بدلہ بے بہا اور بدی کا بمطابقِ عمل

میں نے ابتدا میں تین آیات تلاوت کی ہیں' حدیث کے مطالعہ سے قبل ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پہلی آیت سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۰ ہے جس میں فرمایا: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ ''جو کوئی نیکی کا کوئی عمل کرے گا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہوگا''۔ یعنی اللہ کی راہ میں اگر آپ نے سو روپیہ دیا ہے تو آپ اللہ کی طرف سے ایک ہزار روپے کے حق دار قرار پائیں گے۔ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو اسے بس اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی کہ اس نے برائی کی تھی اور ان لوگوں پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی''۔ یعنی اگر آپ نے کسی کے دس روپوں میں خیانت کی ہے تو آپ کو اتنی ہی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی۔ گویا نیکی کی جزا اللہ تعالیٰ بڑھا کر دیں گے (اس آیت میں تو

دس گنا' جبکہ بعض آیات میں سات سو گنا اور بعض میں بے بہا اور اَن گنت اجر کا ذکر ہے)' جبکہ اس کے برعکس بدی کی جزا اتنی ہی ہے جتنا کہ کسی نے عمل کیا ہے۔

دوسری آیت سورۃ القصص کی آیت ۸۴ ہے' فرمایا: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ﴾ ''جس کسی نے کوئی نیکی کمائی اس کے لیے اس سے بہت بہتر بدلہ ہے''۔ اب یہاں گنتی نہیں بتائی گئی' بلکہ مطلق بات کی گئی کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے بہت بہتر ہوگا۔ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۴﴾ ''اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کو برائی کا بدلہ اتنا ہی دیا جاتا ہے جتنا کہ اس نے عمل کیا ہوتا ہے۔''

تیسری آیت سورۃ المؤمن کی آیت ۴۰ ہے اور اس آیت میں ماقبل دونوں آیات کے برعکس پہلے بدی کا ذکر ہے اور پھر نیکی کا۔ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ﴾ ''جو کوئی کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے بدلہ نہیں ملتا مگر اسی قدر جتنا اس نے بدی کی ہے'' ﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ.....﴾ ''اور جس نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور ہو وہ مؤمن.....''

نیکی کی قبولیت کے لیے ایمان شرطِ لازم!

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ کوئی کافر اور مشرک بھی بعض اوقات نیکی کا کام کرتا ہے' لیکن ان کی وہ نیکی قبول نہیں ہوتی' اس لیے کہ نیکی کی قبولیت کے لیے مؤمن ہونا شرطِ لازم ہے' یعنی وہ اللہ کو مانتا ہو اور اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ نیکی کے حوالے سے ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کے درس ۲ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ موجود ہے جو تقویٰ اور نیکی کی اصل حقیقت کے حوالے سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے۔ چنانچہ اس آیت کو ''آیۃ البر'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں واضح طور پر فرما دیا گیا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى

حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ.....﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں.....''

اس آیت میں بہت سی نیکیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے' لیکن اوّلین اور شرطِ لازم ایمان کو قرار دیا گیا ہے' اس لیے کہ درحقیقت ایمان سے نیت کا تعین ہوتا ہے کہ آپ نیکی کس لیے کر رہے ہیں۔ اگر تو اللہ پر ایمان ہے تو یہ نیکی اللہ کے لیے ہے اور اللہ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے ہے' اور اگر ایمان نہیں ہے تو پھر ریاکاری ہو رہی ہوگی یا دنیا کا کوئی اور مقصد پیش نظر ہوگا۔ مثلاً کسی نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کر دی ہے اور وزیراعظم سے اس کا افتتاح بھی کرا لیا ہے' لیکن اس کے پیش نظر لوگوں کی فلاح و بہبود نہیں' بلکہ بہت سے دوسرے فائدے اٹھانا ہے' لہٰذا نیکی کی قبولیت کا دارومدار آپ کی نیت پر ہے۔

دوسری بات اس آیت میں یہ فرمائی گئی کہ نیکی کی قبولیت کے لیے آخرت کا یقین بھی ضروری ہے' یعنی اس نیکی کا کوئی بدلہ دنیا میں مطلوب نہ ہو' بلکہ اس کا پورے کا پورا اجر آخرت میں مطلوب ہو۔ اس لیے کہ دنیا کے بدلے کے لیے کوئی بھی کام کرنا کاروبار اور تجارت کے زمرے میں آتا ہے جو حلال طریقے سے ہو تو جائز ہے' حرام نہیں ہے۔ لیکن نیکی کے کام میں اس کا کوئی بدلہ دنیا میں اگر مطلوب ہے تو وہ نیکی نہیں رہے گی' بلکہ نیکی کی نفی ہو جائے گی۔

بہرحال سورۃ المؤمن کی زیر مطالعہ آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جس نے نیکی کا کوئی کام کیا' خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اور ہو وہ مؤمن'' ﴿فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۴۰﴾ ''تو وہ لوگ ہوں گے جو جنت میں داخل کیے جائیں گے اور وہاں انہیں جو کچھ ملے گا وہ حساب کتاب سے ماورا ہوگا''۔ یعنی نیکی کا اجر' دس گنا یا سات سو گنا میں مقید نہیں ہے' بلکہ

نیکی کا جو اجران کے لیے جنت میں ہے‘ اس کا تو کوئی حساب کتاب ہی نہیں ہے۔

جنت کی نعمتیں: انسانی تصور سے ماوراء

میں بہت دفعہ یہ واضح کر چکا ہوں کہ قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں ان چیزوں کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں ہم جانتے بھی ہیں اور جو یہاں موجود بھی ہیں‘ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ.....﴾ (البقرۃ:۲۵) ’’جب بھی انہیں دیا جائے گا وہاں کا کوئی پھل رزق کے طور پر (یعنی کھانے کے لیے) وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا.....‘‘ وہاں آم دیا جائے گا تو اہلِ جنت کہیں گے کہ ہم تو دنیا میں بھی آم کھاتے تھے‘ لیکن اس آم کی جو لذت ہوگی اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دوسری اصولی بات اس حوالے سے یہ ہے کہ قرآن مجید میں مذکور ساری نعمتوں کی حیثیت دراصل ابتدائی مہمان نوازی کی ہے‘ جسے عربی میں نُزُل کہتے ہیں۔ نَزَلَ یَنْزِلُ بمعنی اُترنا۔ جیسے ہی کوئی شخص آپ کے دروازے پر آیا اور کسی سواری سے اترا‘ تو وہ ’’نَزِیل‘‘ ہے اور آپ فوری طور پر موسم کے مطابق کوئی ٹھنڈا یا گرم اسے پیش کر دیتے ہیں اس کو نُزُل کہتے ہیں۔ اب اگر وہ آپ کے ہاں مقیم ہو گیا تو وہ ’’ضَیف‘‘ یعنی مہمان ہے اور پھر اس کی ضیافت ہوگی جس کے لیے آپ یقیناً اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ سے عمدہ اہتمام کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے مہمانوں یعنی اہل جنت کی ضیافت جن نعمتوں کے ذریعے کریں گے ان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ :اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ، فَاقْرَءُ وْا اِنْ شِئْتُمْ : فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها۔ یہ حدیث بخاری و مسلم اور صحاح ستہ کی دیگر کتب کے متعدد ابواب میں بیان ہوئی ہے۔

’’اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا گمان ہی گزرا۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا:) اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ’’پس کوئی جان یہ نہیں جانتی کہ ان (اہلِ جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے (السجدۃ:۱۷)۔‘‘

اہلِ ایمان جنت کی نعمتوں کے مستحق ہیں!

بہر حال قرآن مجید میں اہلِ جنت کی ابتدائی مہمانی کے لیے جن دنیوی نعمتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے‘ اُن سے اہلِ ایمان نے اپنے آپ کو یا تو حرام ہونے کی وجہ سے روکے رکھا یا وہ ان چیزوں سے اس لیے لطف اندوز نہیں ہو سکے کہ وہ اللہ کے دین کی جِدّوجُہد کے اندر لگے رہے — اچھا کھانا‘ اچھا پہننا حرام نہیں ہے‘ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ﴾ (الاعراف:۳۲) ’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیں کہ کس نے حرام کی ہے وہ زینت جو اللہ نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لیے؟ اور (کس نے حرام کی ہیں) پاکیزہ چیزیں کھانے کی؟‘‘ اچھی اور پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے بنائی ہیں۔ ویسے دنیا میں تو وہ یہ سب کافروں کو بھی دے دیتا ہے‘ لیکن قیامت کے دن تمام نعمتیں اہل ایمان کے لیے خالص ہو جائیں گی اور پھر وہاں کافروں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ لیکن فرض کیجیے کہ آپ انقلابی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور آپ کا سارا وقت اللہ کے دین کو پھیلانے اور غالب کرنے کی جدوجہد میں لگ رہا ہے تو آپ دنیا کو زیادہ نہیں کما پائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ان نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ آپ کہاں آم اور انگور وغیرہ خرید کر کھا سکیں گے؟ وہ تو دو وقت کی روٹی مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ لہٰذا یا تو حلال اور حرام پر کاربند ہونے کی وجہ سے بندۂ مؤمن ان نعمتوں سے محروم ہو گیا یا اس نے اپنی ساری توجہ دین کے لیے لگائی اور اب اس کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ زیادہ کما سکے‘ لہٰذا اس وجہ سے وہ محروم رہ گیا۔

اس کا منطقی طور پر بدلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ نعمتیں اسے آخرت میں بھرپور طریقے پر ملیں۔ اس لیے کہ اس نے حرام کمائی نہیں کی اور ان نعمتوں سے خود بھی محروم رہا اور اپنے بچوں کو بھی محروم رکھا‘ ورنہ کون نہیں چاہتا کہ جب بھی شام کو گھر آئے تو اپنے بچوں کے لیے پھلوں کا ٹوکرا بھر کر لائے۔ لیکن جو شخص حلال کی کمائی کر رہا ہے وہ کیسے لائے گا‘ کیسے کھائے گا‘ کیسے کھلائے گا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن یہ کیا باتیں کرتا ہے کہ اہلِ جنت کے لیے شرابِ طہور ہوگی‘ دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی‘ پھلوں کے باغات ہوں گے‘ حوریں ہوں گی‘ خدمت گار نوعمر لڑکے ہوں گے‘ وغیرہ۔ جن کے اوپر ذرا تصوف کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو چیزیں اہلِ جنت کے لیے بتائی جا رہی ہیں‘ یہ تو بڑی گھٹیا سی چیزیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا بلاجواز ہے‘ اس لیے کہ ایک بندۂ مؤمن دنیا میں ان تمام چیزوں سے محروم رہا تو اس کا منطقی طور پر بدلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ نعمتیں بھرپور ترین سطح پر اسے آخرت میں مہیا ہوں۔

حدیث قدسی اور وحی خفی

اب آیئے اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث کی طرف‘ جسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کر رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے روایت کر رہے ہیں۔ گویا یہ حدیث قدسی ہوگئی۔ یہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی جو حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے تو ایسی احادیث کو اصطلاحِ حدیث میں ’’حدیث قدسی‘‘ کہا جاتا ہے۔ ان احادیث قدسیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی خفی بھی حضور ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی ایک وحی جلی تھی جو قرآن میں درج ہوتی تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وحی جلی کا ایک حرف بھی قرآن کے اندر درج ہونے سے رہ گیا ہو۔ دوسری طرف وحی خفی بھی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی تھی‘ جو ہوتا تو اللہ کا کلام تھا‘ لیکن یہ قرآن میں درج نہیں ہوتی تھی۔

وحی خفی صرف انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے مخصوص نہیں‘ بلکہ یہ کسی نہ کسی درجے میں آپ کو اور مجھے بھی ہوتی ہے۔ کبھی الہام سا ہو جاتا ہے‘ کبھی دل میں بات آ جاتی

ہے‘ کبھی انسان سچا خواب دیکھتا ہے‘ مثلاً آپ نے خواب میں ایک واقعہ دیکھا جو کچھ دنوں بعد جوں کا توں ظہور پذیر ہو گیا تو یہ سب بھی وحی خفی کی مثالیں ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ ہم نے شہد کی مکھی کو وحی کی ہے‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کی گئی‘ حالانکہ وہ نبی تو نہیں تھیں اور نبوت تو خواتین کے لیے ہے ہی نہیں‘ تو یہ وحی خفی ہے۔ اس حوالے سے یہ اصول یاد رکھیں کہ وحی خفی جب کسی نبی پر آتی ہے تو وحی جلی کی طرح بالکل محفوظ ہوتی ہے اور اس میں کوئی شیطانی اثرات شامل نہیں ہو سکتے‘ لیکن جو وحی خفی غیر نبی پر آتی تو وہ غلط بھی ہو سکتی ہے‘ اس میں شیطانی آمیزش بھی ہو سکتی ہے اور اس میں ہماری خواہشاتِ نفس کے تقاضے بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ جیسے فرائڈ کے نزدیک خواہشاتِ نفس ہی خواب کا روپ دھار لیتی ہیں جب وہ کسی وجہ سے پوری نہیں ہوتیں۔ درحقیقت یہ وہ خواب ہیں جن کو نفسانی خواب کہا گیا ہے‘ جبکہ ایک خواب سچے ہوتے ہیں جو اللہ اور ملائکہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور یہی خواب وحی خفی کا مصداق ہیں۔

نیکی کا اجر‘ حساب کتاب کی قید سے آزاد

بہرحال زیر مطالعہ حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ، ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ)) ’’دیکھو اللہ نے نیکیاں اور بدیاں طے کر دی ہیں اور پھر ان کو واضح بھی کر دیا ہے‘‘۔ وہ حدیث ہم پڑھ چکے ہیں: ((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ)) کہ حلال بھی بالکل واضح ہے اور حرام بھی بالکل واضح ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً)) ’’جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور پھر اس پر عمل نہیں کر سکا تو اس ارادے پر بھی اسے ایک مکمل نیکی کی جزا مل جائے گی‘‘۔ عمل نہ کرنے کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں‘ یا تو حالات نے اجازت نہ دی ہو‘ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑ گیا ہو‘ لیکن اس نے ارادہ کیا تھا تو اب ارادہ کرتے ہی اسے ایک نیکی مل جائے گی۔ زیر مطالعہ جملہ میں هَمَّ کا لفظ آیا ہے‘ اسی سے لفظ ’’اہتمام‘‘ ہے اور اسی سے ’’ہمت‘‘ کا لفظ بنا

ہے۔لہٰذا اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی نے نیک کام کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی‘ لیکن وہ اپنے ارادے کو بعض خارجی موانع کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا —— فرض کیجیے کہ اپنے مال میں سے بڑا صدقہ نکالنا چاہتا تھا لیکن مال پر ڈاکہ پڑ گیا تو اب مال ہی نہیں رہا جسے صدقہ کر سکے —— یا اپنی سستی کی بنا پر اس پر عمل نہیں کر پایا‘ یا اندرونی کیفیات کی وجہ سے نیکی کا ارادہ کچھ کمزور پڑ گیا‘ لیکن چونکہ اس نے ارادہ تو کیا تھا‘ لہٰذا اس ارادے کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے پاس ایک مکمل نیکی لکھ لے گا۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ)) ’’اور اگر اس نے ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس ایک نیکی کو اپنے ہاں دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ لکھ لیتا ہے‘‘۔ یہ ہے اللہ کا معاملہ کہ ایک نیکی پر کتنا اجر دیتا ہے۔اسی حوالے سے میں آپ کو قرآن کی ایک اور آیت سنا دیتا ہوں —— قرآن وحدیث ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ایک کی تعلیم وحی جلی میں آئی ہے اور ایک کی وحی خفی میں‘ احادیث اکثر و بیشتر وحی خفی پر مبنی ہیں —— یہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۱ ہے‘ جس میں فرمایا گیا: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ ’’مثال ان لوگوں کی جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانے کی سی ہے‘‘۔گندم کا دانہ‘ چاول کا دانہ‘ چنے کا دانہ یا کوئی اور دانہ جسے آپ نے زمین میں بو دیا تو ﴿اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ ’’اس میں سے سات بالیاں (سٹّے) پیدا ہوں‘‘۔اگر آپ نے گندم کا دانہ زمین میں بویا تھا تو اس میں سات سٹّے گندم کے لگے ہوئے ہیں یا مکئی کا دانہ بویا تھا تو مکئی کے سات سٹّے لگے ہوئے ہیں اور ان سات سٹّوں میں سے: ﴿فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ ’’ہر سٹّے کے اندر سو دانے ہیں‘‘۔تو اب سات کو سو سے ضرب دیں تو یہ سات سو ہو گئے۔یہی حساب اس حدیث میں آ رہا ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ کم از کم دس نیکیاں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر سات سو گنا تک جائے گا اور بعض اوقات یہ اتنی بار ضرب کھائے گا کہ حساب کتاب کی حد سے ماوراء ہو جائے گا۔اسی طرح اس آیت کے

آخر میں بھی فرمایا گیا کہ پھر اللہ اس اجر کو دو گنے سے چوگنا کرتا رہے گا: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾﴾ ’’اور اللہ بڑھا چڑھا کر دے گا جس کے لیے چاہے گا۔اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

قوانینِ الٰہیہ ہر منطق سے ماوراء ہیں!

یہ تو نیکی کی بات ہو گئی‘ جبکہ برائی کا معاملہ اس سے الگ ہے اور وہاں حساب کتاب نہیں چلے گا۔اس بارے میں فرمایا: ((وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً وَاحِدَةً‘ وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً)) ’’اور اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنے ہاں ایک نیکی درج کر لے گا‘ اور اگر برائی کا ارادہ کر کے عمل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اسے صرف ایک ہی گناہ لکھتا ہے‘‘۔یعنی کسی نے بدی کا ارادہ کیا تھا‘ لیکن اس پر عمل کرنے سے کسی وجہ سے باز رہا۔اب یہ باز رہنا کسی خارجی مانع کے تحت بھی ہو سکتا ہے‘ مثلاً چوری کے ارادے سے کہیں جا رہا تھا لیکن ابھی وہاں تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ پولیس والوں نے پکڑ لیا تو وہ چوری نہیں کر پایا۔اب منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے بدلے میں اسے کچھ نہیں ملنا چاہیے‘ اس لیے کہ وہ تو چوری کرنے جا رہا تھا‘ اگر خارجی مانع نہ آتا تو وہ یہ برائی کر گزرتا‘ لیکن اس سب کے باوجود اگر چوری نہ کر سکا تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی۔ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے بدی کا ارادہ کیا‘ لیکن ساتھ ہی باطنی کیفیت کے اندر ضمیر کی خلش جاگ گئی اور وہ باز آ گیا تو اس صورت میں تو لازماً اس کا حق ہے کہ اس کو نیکی کا درجہ دیا جائے۔

اب دیکھئے یہ ساری چیزیں جو یہاں آ رہی ہیں‘ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ منطق سے بہت اونچا ہے۔اس ضمن میں خاص طور پر سورۃ الحجرات کی آیات بہت اہم ہیں۔فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ ’’یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو‘ بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے

ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا‘‘۔ یعنی تم جو اسلام کی مخالفت کر رہے تھے وہ تم نے ختم کر دی‘ لیکن اس طرح تم مؤمن تو نہیں ہوئے نا! اب منطق تو یہی کہے گی کہ جب وہ حقیقتاً مؤمن نہیں ہیں اور مسلم انہیں مانا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ منافق ہیں اور منافق کی کوئی نیکی قبول نہیں ہونی چاہیے —— لیکن یہاں ان کے اعمال کی قبولیت کا اعلان بھی ہے۔ گویا یہاں منطق نہیں چلے گی‘ بلکہ اللہ کا فضل و کرم اور اُس کی رحمت چلے گی: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ’’اگر تم اطاعت کرتے رہو (اس حال میں بھی کہ ایمان تمہارے دلوں میں نہیں ہے) تو اللہ تمہارے اجر و ثواب میں کمی نہیں کرے گا‘‘۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴﴾ ’’یقیناً اللہ انتہائی بخشنے والا‘ بے پناہ رحم کرنے والا ہے‘‘۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین ہر منطق سے ماورا ہیں۔

اسی طرح بعض احادیث کی رو سے اور قرآن مجید کے چند ایک مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے گناہ کا ارتکاب کیا تو ایمان اس کے دل سے نکل گیا۔ اس کے بعد اگر اس نے توبہ کر لی تو ایمان واپس آ گیا۔ یہ بات تو منطقی ہے لیکن قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ بندۂ مؤمن جیسے ہی گناہ سے فارغ ہوتا ہے تو وہ ایمان جو اس کے دل سے نکل گیا تھا‘ فوراً واپس آ جاتا ہے۔ یہ بات منطق کے تو خلاف ہے۔ توبہ کے بعد ایمان کا واپس آ جانا تو سمجھ میں آتا ہے‘ لیکن محض گناہ کا ارتکاب ختم ہونے کے بعد ایمان کا واپس لوٹ آنا منطق کے خلاف ہے‘ لیکن ہم اس کو مانیں گے‘ اس لیے کہ یہ اللہ ربّ العزت کا فضل ہے جو کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ جیسے آج کی زیر مطالعہ حدیث میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نیکی کے ساتھ اللہ کا معاملہ کچھ اور ہے‘ جبکہ بدی کے ساتھ کچھ اور ہے۔ بدی کی صورت میں اس کے برابر سزا ملے گی‘ اس کے برعکس نیکی کے معاملے میں دس گنا‘ سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔ اب منطق اس کو نہیں مانتی کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے زیادہ ہو‘ لیکن ان چیزوں کے اندر بات منطق کی نہیں‘ اللہ کے فضل و کرم کی ہے۔

اللہ عزوجل کی وسعتِ رحمت

سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۶) میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ﴾ ’’اور میری رحمت ہر شے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے‘‘۔ اسی طرح یہ حدیث قدسی بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے: ((سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ)) ’’میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے جاتی ہے‘‘ —— یقیناً اللہ تعالیٰ سزا دینے والا بھی ہے‘ شدید العقاب بھی ہے‘ لیکن ساتھ ہی غفور بھی ہے‘ رحیم بھی ہے اور اس کی شانِ غفوری اس کی سزا والی شان سے بالاتر ہے۔ بہرحال وہ بدلہ لینے والا بھی ہے اور سزا دینے والا بھی ہے۔ آخر جہنم کس لیے بنائی ہے‘ حساب کتاب کس لیے ہو رہا ہے‘ کراماً کاتبین جو ہر وقت ہمارے اعمال لکھ رہے ہیں‘ یہ سب کس لیے ہے؟ اس لیے کہ اسی کی بنیاد پر ہمارا حساب کتاب ہوگا‘ جزا و سزا بھی ملے گی۔ یہ سب ہوگا‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ’’رحمتِ حق بہانہ می جوید‘‘ یعنی رحمتِ خداوندی تو بہانہ چاہتی ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہو‘ بنیاد ہو تو اس کی رحمت جوش میں آ جائے۔ اس قول کو اس طرح بھی پیش کیا جاتا ہے: ’’رحمت حق بہانمی جوید‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنی قیمت نہیں چاہتی —— چنانچہ قرآن مجید میں چار جگہ آیا ہے: ﴿وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۵۱‘ یوسف:۶۴ و ۹۲‘ الانبیاء:۸۳) ’’وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے‘‘۔ حضور ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ سوچو تو سہی کہ کیا کوئی ماں کبھی چاہے گی کہ اس کے بچے کو آگ میں ڈال دیا جائے؟ اسی طرح اللہ بھی نہیں چاہے گا کہ اپنی مخلوق کو آگ میں ڈالے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ﴾ (النساء:۱۴۷) ’’اللہ کو کیا لینا ہے تمہیں عذاب دے کر اگر تم اللہ کے شکرگزار بندے بنو اور اس پر ایمان لاؤ!‘‘ کچھ لوگوں کو دوسروں کو اذیت دینا پسند ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ! اللہ عزوجل ایسا ہرگز نہیں ہے‘ بلکہ رحمت خداوندی تو بہانہ چاہتی ہے اور اس کی رحمت کی وسعت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔

انسان کی اندرونی کیفیت کے تین درجات

زیرِ مطالعہ روایت بھی اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت کی مظہر ہے جس میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے لیے مکمل نیکی لکھی جائے گی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خارجی مانع کی وجہ سے برائی نہیں کر سکا یا پھر خود اس کے اندر ہی کچھ کشاکش شروع ہو گئی جس کی وجہ سے وہ برائی سے رک گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ خیر و شر کی کشاکش ہمارے اندر برپا رہتی ہے۔ ہمارا نفسِ امارہ ہمیں نیچے کھینچتا ہے‘ جبکہ روح ملکوتی اوپر کھینچتی ہے۔ ع ’’ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر!‘‘

فرائڈ کے حوالے سے یہ بات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ صرف نفسانی خوابوں کا تجزیہ کرتا ہے کہ خواہشاتِ نفس جب پوری نہیں ہوتیں تو وہ خواب کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس کی یہ بات ٹھیک ہے‘ لیکن اسے پتا ہی نہیں ہے کہ ملکوتی خواب اور سچا خواب بھی کوئی حقیقت ہے۔ بہرحال فرائڈ کی ایک بات سے میں اس کی ذہانت کا قائل ہوں۔ اس نے انسان کی اندرونی کیفیت کے تین درجے معین کیے اور میں حیران ہوں کہ یہی تین درجے قرآن بیان کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق سب سے نیچے نفس امارہ ہے‘ اور یہ انسان کے اندر موجود حیوانی جبلتوں (animal instincts) کی سطح ہے۔ حیوانی جبلت کا تقاضا ہے کہ کھاؤ‘ اس لیے کہ یہ جسم کی ضرورت ہے‘ جبکہ نفسِ انسانی یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میں لذتیں ہوں اور طرح طرح کے ذائقے ہوں‘ تنوع ہو‘ اسراف ہو‘ لیکن انسان کے اندر ایک روح ملکوتی بھی ہے جو اسے اللہ کے قریب لانا چاہتی ہے۔ اوپر روح ملکوتی ہے اور نیچے نفس امارہ ہے‘ جبکہ بیچ میں قلب ہے۔ ’’قلب‘‘ لغوی طور پر اس شے کو کہتے ہیں جو بدلتا رہتا ہے۔ اسی سے انقلاب ہے‘ یعنی نظام کا بدل جانا۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب میں بادشاہی نظام ختم ہوا اور جمہوری نظام آ گیا..... بالشویک انقلاب میں سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوا اور کمیونزم آ گیا..... انقلابِ ایران میں شہنشاہِ ایران کی حکومت ختم ہو گئی اور علماء کی حکومت آ گئی۔

قلب کا لفظ قرآن میں بھی آیا ہے‘ فرمایا: ﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ (التوبۃ: ۴۸) ’’اور (اے نبی ﷺ! یہ منافق) آپ کے لیے معاملات کو الٹ پلٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں‘‘۔ درحقیقت یہ قلب جسم کا ایسا عضو ہے جس کے لیے آرام ہے ہی نہیں۔ دماغ بھی آرام چاہتا ہے‘ اسے نیند چاہیے‘ البتہ اگر آپ بہت زیادہ سوئیں گے تو دماغ کی چکی چلنی شروع ہو جائے گی اور پھر وہ آپ کو خواب دکھانے شروع کر دے گا‘ جن میں سے اکثر و بیشتر نفسانی خواب ہی ہوتے ہیں جو نفس امارہ سے متعلق ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو دماغ کی بات ہو گئی‘ لیکن قلب کے لیے کوئی آرام نہیں ہے‘ قلب ہر وقت یا تو سکڑ رہا ہے یا پھیل رہا ہے اور اس کے لیے آرام کا مطلب موت ہے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ انسانی شعور کی نچلی سطح پر id یا libido ہے‘ یعنی انسان کے حیوانی تقاضے اور حیوانی جبلتیں۔ اس کے اوپر ego ہے‘ جس کو ہم قلب کہتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے‘ لیکن اس کے اوپر جو روح ہے‘ اس کو وہ نہیں پہچان سکا۔ وہ اس بات کو مانتا ہے کہ ego کے اوپر کوئی اور چیز ہے سہی اور وہ اس کو super ego کہتا ہے۔ پھر وہ اس کو ایسے define کرتا ہے کہ معاشرے میں موجود نیکی اور بدی کے تصورات انسان کو خبردار کرتے رہتے ہیں کہ تم یہ کام نہ کرو‘ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ لہٰذا معاشرے کے اندر موجود اثر‘ گویا اس کی ego کے اوپر ایک طرح کی مزید رکاوٹ ہے جو اس کو برائی سے روکتا ہے۔

روح کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے!

علمِ نفس کے حوالے سے مجھے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو حاصل ہوا ہے‘ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نفسِ امارہ ہے اور ایک روح ہے جو اللہ کی طرف سے ہے۔ آدم کی تخلیق اور اس کے تسویہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (الحجر) ’’پھر جب میں اس کی نوک پلک درست کر لوں اور پھونک دوں میں اس میں اپنی روح میں سے‘ تو گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں‘‘۔ اس روح کا تعلق براہِ راست

ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔لیکن یہ تعلق کیسے ہے اور کیا ہے‘ اس کا صحیح ادراک ہمیں نہیں ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جان (life) کس چیز کا نام ہے اور یہ کہاں ہوتی ہے۔آج بھی ڈاکٹروں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مریض دل کے بند ہونے سے مر گیا یا دماغ کے ڈیڈ ہونے سے۔ چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ اصل میں یہ جان ہے کہاں اور یہ کس عضو سے وابستہ ہے‘ دل سے یا دماغ سے۔ جب ہم اس کے بارے میں نہیں جانتے تو روح کے بارے میں ہم کیا سمجھیں گے۔روح تو جان سے کہیں زیادہ لطیف تر شے ہے‘ جبکہ زندگی تو حیوانی مظہر (phenomenon) ہے۔ یہ زندگی تو کتے میں ہے‘ بلے میں ہے‘ بیل میں ہے‘ بکرے میں ہے‘ حتیٰ کہ گھاس کے تنکے میں بھی ہے۔اگر وہ اپنی جڑ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو اس میں بھی جان ہے جسے نباتاتی زندگی کہتے ہیں۔روح کے بارے میں ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جانِ ناس!

روح ایک اتصال ہے‘ لیکن اس اتصال کی کیفیت کو ہم نہیں جان سکتے اور اسے کسی نوع کے اتصال پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ اتصال ہے انسانوں کے رب کا انسانوں کی جان کے ساتھ!

ہمیں معلوم ہے کہ یہ انگلیاں متصل ہیں‘ جیسے حضور ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ))(۱) یعنی میری بعثت اور قیامت اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے یہ انگلیاں جڑی ہوئی ہیں۔ میرے بعد قیامت ہے‘ اور اب نہ کوئی نبی آئے گا نہ کوئی رسول آئے گا۔ گویا قیامت کی سب سے بڑی نشانی حضور ﷺ کی بعثت ہے۔ بہرحال روح اتصال ہے لوگوں کے رب کا انسانوں کی جان کے ساتھ۔ یہاں جان سے مراد یہ حیوانی زندگی اور بائیولوجیکل لائف نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ روح ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں الفاظ نہیں ہیں اور ہم روح کو بھی جان کہہ بیٹھتے ہیں اور

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی بعثت انا والساعة کهاتین۔

جان کو روح سمجھتے ہیں‘ حالانکہ جان بالکل علیحدہ شے ہے جو تمام حیوانات اور تمام نباتات میں ہے۔اللہ تعالیٰ کی کروڑہا مخلوقات زمین میں ہیں‘ پانی میں ہیں‘ ہواؤں میں ہیں اور وہ سب جاندار ہیں۔انسان میں بھی جان ہے‘ لیکن اس کی شان یہ ہے کہ اس کی تکمیل اور اس کے تسویہ کے بعد اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے روح پھونک دی تو اب یہ روح انسان کو اوپر کھینچتی ہے‘ جبکہ نفس امارہ نیچے کھینچتا ہے اور قلب بیچ میں ہے۔اگر نفس امارہ غالب ہو جائے تو وہ قلب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔قلب چونکہ آئینہ کی مانند ہے لہٰذا اب نفس کی ساری ظلمانیت قلب میں منعکس ہو کر پورے وجود کے اندر طاری ہو جائے گی اور اگر قلب کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو روح کی نورانیت قلب میں منعکس ہو کر پورے وجود میں سرایت کر جائے گی۔

سب سے بڑی نیکی: دینِ الٰہی کے نفاذ کی جدّوجُہد

قرآن وحدیث کی روشنی میں آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی کا صرف ارادہ کرنے پر ایک نیکی مل جاتی ہے اور اس پر عمل کر لینے سے اس پر دس گنا‘ سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بے حساب کتاب اجر ملے گا‘ جبکہ اس کے مقابلے میں برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل نہ کرنا از خود ایک نیکی شمار ہو گی اور اگر برائی کر لی تو پھر اس کے مطابق اور اسی کی مقدار سزا ملے گی۔ یہ گویا اس حدیث ((سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ)) اور اس آیت ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ کی بھی ایک توجیہہ ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دامن رحمت میں لے لے اور ہم کم از کم نیکیوں کا ارادہ کرنے کا تو فیصلہ کر لیں۔

یاد رکھیں کہ سب سے بڑی اور سب سے پہلی نیکی اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کرنا ہے‘ اور پھر اس میں بالفعل جِدّوجُہد کرنا‘ تَن مَن دَھن لگانا یہ سب سے اونچی نیکی ہے۔اگر یہ ارادہ ہی نہیں ہے تو اللہ کو تمہاری نمازیں‘ روزے درکار نہیں ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ اگر تم میرے وفادار ہو تو پھر طاغوت کے وفادار کیسے ہو گئے؟ یہ دو باتیں تو یکجا نہیں ہو سکتیں۔پچھلی دفعہ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ہمارے

زیر مطالعہ آئی تھی: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ.....﴾ (آیت ۲۵۶) ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے.....'' یعنی پہلے طاغوت کا کفر ہے اور پھر اللہ پر ایمان کا مرحلہ ہے۔ گویا اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کر لینا' کم سے کم نیکی ہے اور بلند ترین نیکی وہ ہوگی کہ اس راہ میں وہ وقت بھی آ جائے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم میدان میں حاضر ہو جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت سے سرخرو ہونے کا موقع آ جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کا ارادہ کرنے کی توفیق دے — اور خاص طور پر طاغوت سے بغاوت اور اللہ کی حکومت اور اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کا ہم نہ صرف ارادہ کریں' بلکہ اس پر عملاً کاربند ہوں اور تن من دھن لگائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتOO

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۵)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

تیرھواں اصول:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾

''تمہارے باپ یا تمہارے بیٹے، تمہیں نہیں معلوم کہ اِن میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے۔''

قرآنِ کریم میں بیان کردہ اصولوں میں سے یہ اصول بندے کو مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی عظمت، شریعت میں اس کی حکمت اور بندے کو اپنے علم کی کمی و کوتاہی کے پاس لا کھڑا کرتا ہے۔ سورۃ النساء کے شروع میں آیاتِ میراث کے حوالے سے یہ قاعدہ بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾ (آیت ۱۱)

''تمہارے باپ یا تمہارے بیٹے، تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے۔''

یعنی تمہیں معلوم نہیں کہ دین و دنیا کے اعتبار سے کون تمہارے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ باپ زیادہ فائدہ مند ہے، مگر عملاً بیٹا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور کوئی سمجھتا ہے کہ بیٹا زیادہ فائدہ مند ہے، مگر عملاً باپ زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے زیادہ صحیح پتا ہے کہ تمہارے لیے زیادہ فائدہ مند کون ہے۔ جس میں تمہارے لیے زیادہ فائدہ تھا میں نے اسی طرح حکم دیا ہے، لہٰذا اسی کی پیروی کرو۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ وراثت کو بغیر کسی اصول وضابطہ کے تقسیم کیا کرتے تھے، کبھی والدین کی ضرورت کا زیادہ خیال رکھتے اور کبھی اولاد کی ضرورت کا، اور کبھی درمیان درمیان میں رہتے۔ بالآخر یہ پاکیزہ شریعت آ گئی تاکہ

سابقہ ساری خود ساختہ صورتوں کو بدل دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود وراثت تقسیم کر دی۔ اگر ہم اس قاعدے کو اپنے آج کے حالات پر لاگو کر کے دیکھیں تو ہمیں اپنی سوچ اور معاشرتی معاملات میں بہت ساری غلطیوں کی اصلاح کا موقع ملے گا۔ چند ایک باتیں درجِ ذیل ہیں:

۱) بعض والدین کی اولاد صرف لڑکیاں ہوا کرتی ہیں، جن کی وجہ سے وہ گھبراتے ہیں اور اس آزمائش پر غمگین ہوتے ہیں۔ اب یہ قاعدہ ان کے سامنے آ گیا جس نے ان کے دل میں یقین اور اللہ کی رضا جاگزیں کر دی۔ کتنی ہی بیٹیاں اپنے والدین کے لیے لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ کئی واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس کے بیٹے رزق کمانے کی وجہ سے دور ہو گئے۔ اَب اس بوڑھے انسان کے پاس جس کی جسمانی قوت ختم ہو رہی تھی اور اس کی ہڈیاں بھی کمزور ہو چکی تھی صرف ایک بیٹی تھی جس نے اس بوڑھے باپ پر بہت توجہ دی، بہت اہتمام سے اس کی ضروریات کو پورا کیا اور اس کی صحت کا خیال رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾ (النساء: ۱۱)

''تمہارے باپ یا تمہارے بیٹے، تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے۔''

یہ تو تھا دنیا کا معاملہ، آخرت کی بات تو اور بھی زیادہ عظیم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''تمہارے والدین یا تمہاری اولاد میں سے جو زیادہ اللہ کا اطاعت گزار ہوگا، وہی قیامت کے روز زیادہ اونچے درجے پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی باہم ایک دوسرے کے حق میں سفارش قبول کریں گے۔ اگر جنت میں والد کا درجہ بلند ہوا تو اس کے بچے کو اس کے مقام تک پہنچا دیا جائے گا اور اگر بچے کا مقام بلند ہوا تو اس کے والد کو بچے کے مقام تک پہنچا دیا جائے گا، تاکہ اس طرح ان کی نگاہیں ٹھنڈی رہیں۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم سنتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی ہوں وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں اور بعض تو اپنی بیویوں کو دھمکیاں دینے لگتے ہیں کہ خبردار! اگر بیٹی پیدا کی۔ گویا کہ یہ معاملہ ان عورتوں کے اپنے ہاتھ میں ہے! درحقیقت یہ جہالت کی بات ہے۔ کسی انسان کو کسی ایسے کام پر کیونکر ملامت کیا جا سکتا ہے جو اس کے بس میں نہ ہو؟

اے کاش! جولوگ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان پر غور کر لیتے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾﴾ (الشوریٰ)

''آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔ یا انہیں جمع کر دیتا ہے' بیٹے بھی بیٹیاں بھی' اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ بڑے علم والا اور کامل قدرت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور بندہ اس پر ناراض ہو! کیا ایسے بندے کو اس پر سزا نہیں ہونی چاہیے؟

جس کسی کے حصے میں یہ بیٹیاں آ جائیں اُسے اِن احادیث کو یاد کرنا چاہیے جن میں بیٹیوں کی پرورش کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے بیٹیوں کی پرورش کی اور بالغ ہونے تک انہیں پالا' وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

بچیوں کی وجہ سے پریشان ہونے والے کو نصیحت کی خاطر کہا جائے گا:

مان لیا تو پریشان ہے اور تجھے سخت تکلیف ہے۔ کیا اس طرح تیرے گھر میں بیٹے پیدا ہو جائیں گے؟ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ لوگوں کی اکثریت لڑکوں کو پسند کرتی ہے' لیکن مؤمن اس آزمائش کو دوسری نظر سے دیکھتا ہے' اور وہ ہے صبر کی شکل میں عبادت' اور اللہ کی رضا پر راضی رہ کر عبادت کا حق ادا کرنا۔ کچھ اہل توفیق ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسی بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اُن کو علم ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے پسند کی ہے وہ اُن کی اپنی پسند سے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکوں سے محروم کر کے بہت بڑے شر سے محفوظ کر لیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اس ناخلف لڑکے پر حضرت خضر علیہ السلام کو مسلط نہیں کیا تھا جسے بعد میں انہوں نے قتل کر دیا تھا' پھر اپنے اس فعل کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

﴿وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾﴾ (الکھف)

''اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے' ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی

سرکشی اور کفر سے عاجز اور پریشان نہ کر دے۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ انہیں ان کا پروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر پاکیزگی والا اور اس زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عطا فرمائے۔''

جس طرح اس قرآنی اصول میں ان لوگوں کے لیے تسلی کا سامان ہے جن کو بیٹیاں عطا ہوئیں اسی طرح ان لوگوں کے لیے دل کو مضبوط کرنے کی بات ہے جن کو معذور اولاد ملی ہو' چاہے ان کی معذوری کانوں سے متعلق ہو یا آنکھوں سے متعلق یا عقل سے متعلق یا پھر جسمانی ہو۔ ان سے کہا جا رہا ہے:

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۱۶)

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری سمجھو حالانکہ وہ تمہارے لیے اچھی ہو۔''

اور ان سے یہ بھی کہا جائے گا: قسم بخدا' تمہیں قطعاً علم نہیں تمہاری کون سی اولاد تمہیں زیادہ نفع دینے والی ہوگی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہی معذور بچہ آخرت سے پہلے دنیا میں ہی تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو جائے۔

دنیا کا معاملہ ہی دیکھ لیجئے۔ ممکن ہے ان معذور بچوں کے والدین کے لیے ان آزمائشوں نے تعلق باللہ' خلوت کی دعاؤں اور اس آزمائش سے نکلنے کی امید کی راہیں کھول دی ہوں اور ان معذور بچوں کے والدین کے دلوں میں صبر و برداشت کا کس قدر جذبہ پیدا ہو گیا ہو۔ اگر اس طرح کی آزمائشیں نہ ہوتیں تو یہ خوبیاں انہیں کہاں سے نصیب ہوتیں؟ اور اسی طرح کے بہت سارے فائدے انہیں کہاں سے حاصل ہوتے!

اور آخرت کے فائدے کو سامنے رکھیں۔ ان معذور بچوں کی وجہ سے دنیا میں ان کو جو آزمائش آئی' اس طرح یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے بلندیٔ درجات کا سبب بن گئے۔ ممکن ہے ان کو ان کے اپنے اعمال اس درجے تک نہ پہنچاتے۔

چودھواں اصول:

﴿فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ﴾

''پھر اگر یہ آپ کی بات نہ مانیں تو آپ یقین کر لیں کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں۔''

قرآن کریم کے محکم ترین اصولوں میں سے یہ ایک اصول ہے' جس کے اندر بڑے

اہم اور عظیم معانی پائے جاتے ہیں‘ جن کا تعلق فرمانبرداری‘ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور شرعی احکام مان لینے سے ہے۔

یہ آیت کریمہ سورۃ القصص میں آئی ہے جہاں اہلِ شرک کے ساتھ جھگڑے کا بیان ہے‘ جہاں ان کی طرف سے دشمنی اور عناد کے اُن اسلوبوں کا تذکرہ ہے جن میں انہوں نے شریعت کو ٹھکرایا ہے اور انہوں نے نبی اکرم ﷺ پر گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔

اسی اصول کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (یونس)

’’وہ تمہارا اللہ ہی برحق ذات ہے‘ حق کے بعد کیا ہوسکتا ہے سوائے گمراہی کے؟ پھر تم کہاں بھٹکے جارہے ہو!‘‘

امام ابن القیمؒ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ’’دو ہی راستے ہیں: نفس پرستی یا اطاعتِ وحی‘‘ — اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾﴾ (النجم)

’’اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتا ہے‘ وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔‘‘

جب شریعت کا فیصلہ آجائے اور آدمی پھر بھی اسے نہ مانے اور اس کے اُلٹ کام کرے‘ تو اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

اس اصول کی یاددہانی کی فی زمانہ بڑی شدید اہمیت ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جبکہ خواہشات کی کثرت ہوچکی ہے‘ شرعی احکامات کے ساتھ رنگ برنگا معاملہ کیا جاتا ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف دعوے ہیں‘ کوئی اپنی بدعت کی مدد کررہا ہے‘ کوئی ان نصوص کو لے کر اپنے خاص طریقے کو رواج دے رہا ہے‘ کوئی اپنی دلی تمنا کے مطابق آسانیاں تلاش کررہا ہے‘ اور اللہ اور رسول کی مرضی کا بالکل خیال نہیں۔

لوگوں پر ایک زمانہ ایسا تھا کہ آدمی کوئی کام کرنا چاہتا یا چھوڑنا چاہتا‘ اس کے لیے یہی بات کافی تھی کہ یوں کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے‘ رسول اللہ ﷺ کا فرمان یہ ہے یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے‘ اور وہ بات مان جاتا۔ شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہوتا جو شرعی حکم سے جان بچانے کی کوشش کرتا۔ ایک آج کا زمانہ ہے کہ لوگوں پر معلومات کے دروازے کھل

گئے ہیں‘ فقہی مسائل میں بہت سارے اقوال اُن کے سامنے ہیں۔ درحقیقت یہ مسئلے کی جڑ نہیں ہے‘ مسائل میں اختلافات تو بہت پرانے ہیں‘ اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مقدر کردیا ہے اس کو ختم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اصل مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ کسی مسئلے میں متعدد اقوال کو پاتے ہیں (اور جو ان کی خواہش کے مطابق ہو اُسے لے لیتے ہیں) بھلے یہ قول فقہی اعتبار سے شاذ ہی کیوں نہ ہو‘ کیونکہ ان کو موقع مل گیا کہ اس کام کو حلال کرنے والا ایک قول موجود ہے۔ اور اس کے بالمقابل دوسرے قول کو چھوڑ دیتے ہیں خواہ دوسرا قول سلف صالحین کا اجماع ہی ہو جو اسی کام کو یا قول کو حرام قرار دے رہا ہو۔ کیا ایسے لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حصہ نہیں بنتا جس میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ﴾ (القصص:۵۰)

’’(اے نبی ﷺ!) پھر اگر یہ آپ کی بات نہ مانیں تو یقین کرلیں کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کررہے ہیں۔‘‘

اس مقام پر اس قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو یاد کروانا بھی بہت ضروری ہے:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾﴾ (القیامۃ)

’’بلکہ انسان اپنے دل کے بارے میں خوب آگاہ ہے۔‘‘

یہ قرآنِ کریم کا بہت مضبوط اصول ہے‘ جس کی شرح چوتھے اصول میں گزر چکی ہے۔

اس موقع پر اس اصول کا ذکر کردینا بھی بہت مناسب ہے جو حدیث شریف میں بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ ، وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ)) (۱)

’’نیکی کی پہچان یہ ہے کہ روح کو سکون ملے اور دل مطمئن ہوجائے‘ اور گناہ یہ ہے کہ روح کو کھٹکا لگا رہے اور دل پریشان رہے‘ خواہ لوگ تمہیں (اس کے حق میں) فتویٰ بھی دے دیں۔‘‘

حدیث میں جو بات بیان ہوئی ہے یہ کیفیت وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جس کے دل میں کچھ نہ کچھ نورِ ایمان باقی ہو‘ شہوات وشبہات میں پڑ کر بالکل بجھ نہ گیا ہو۔ البتہ جو شخص فسق وفجور کی وادیوں میں بھٹک رہا ہو‘ اُس کا دل تو وہی فتویٰ دے گا جو اس کی خواہشات کے مطابق

(۱) سنن الدارمی‘ کتاب البیوع۔ ومسند احمد‘ مسند الشامیین

ہوگا۔(اس کا کوئی اعتبار نہیں۔)

ایک موقع پر (مطلب کے فتوے پر عمل کرنے والے) ایک شخص سے بات چیت کرنے کا موقع ملا جو جمہور علماء کی رائے کو چھوڑ کر شاذ اقوال پر عمل کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: ان فقہی موشگافیوں کو ایک طرف رکھو‘ مجھے اپنے دل کا حال سناؤ‘ جب تم اِن باتوں پر عمل کر رہے ہوتے ہو تو تمہارے دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ تو اس نے قسم اٹھا کر کہا: وہ تو بے چین ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے کہ فلاں عالم نے یہ فتویٰ دیا ہے اور وہ خود دل کی گہرائیوں سے اس فتوے سے مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے ساتھی! جس عالم نے یہ فتویٰ دیا ہے وہ تو معذور ہوسکتا ہے کیونکہ یہی اس کا مبلغ علم ہے‘ لیکن تم اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرلو‘ کیونکہ تمارے اسی رویے کے بارے میں اہلِ علم نے فرمایا ہے: ”یہ آسانیاں تلاش کرنے کا طریقہ ہے“۔ اور اہلِ علم نے ایسا کرنے والے کو قابلِ مذمت کہا ہے‘ بلکہ اس کام کو نفاق اور خواہش پرستی کا حصہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے سلف صالحین کی ایک بڑی جماعت کا فتویٰ ہے کہ ”جس نے آسانیوں کا پیچھا کیا وہ بالآخر بے دین ہوجاتا ہے“۔

جس آدمی نے قرآنِ کریم میں مذکور لفظ ”الھَــوٰی“ پر غور کیا ہو اُسے معلوم ہوجائے گا کہ یہ لفظ ہمیشہ قابلِ مذمت کاموں کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انتہائی مقبول نبی (حضرت داوٗدؑ) کو اس دلی بیماری سے دور رہنے کی تاکید کی ہے‘ فرمایا:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾ ﴾ (صٓ)

”اے داوٗد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا‘ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو‘ ورنہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے‘ اس لیے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے۔“

اس کے بعد کون ہے جو ہوائے نفس سے محفوظ ہوسکتا ہے؟ مؤمن کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب بندہ دین میں رخصتوں کو تلاش کر رہا ہوتا ہے تو جو کچھ وہ کرتا ہے یا جو کچھ

(باقی صفحہ 74 پر)

تحریکی جِدّوجُہد اور معاشی تفاوت

حافظ سید اسامہ علی ☆

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کے مابین دنیوی مال و اسباب میں فرق وتفاوت رکھا ہے‘ اور مزید برآں باہمی مسابقت کا جذبہ بھی ودیعت فرمایا ہے‘ جس کے بے شمار نفسیاتی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی سے آگے بڑھ کر کسی مقصد کی خاطر اٹھنے والی عوامی تحریک کی بات کی جائے تو اس کے لیے ان نتائج کا احساس کرتے ہوئے مسائل کی پیش بندی کرنا اہم تقاضا ہے۔ اور جب درپیش مقصد بھی غلبہ واظہارِ دین ہو تو مسئلہ کی حساسیت دوچند ہو جاتی ہے۔ زیرنظر مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ آیاتِ قرآنیہ اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں ایک طرف مال ومتاعِ دنیوی کی اصل حقیقت اور دینی تحریکات میں اہلِ ثروت افراد کے کردار کو واضح کیا جائے‘ اور دوسری جانب صابر وشاکر نادار افراد کا بارگاہِ الٰہی میں مقام ومرتبہ اور نبی رحمت ﷺ کا ان کے ساتھ طرزِ عمل بطورِ اسوہ پیش کیا جائے‘ تاکہ دینی تحریکات سے وابستہ رفقاء وکارکنان ایک دوسرے کی مالی حیثیتوں کے بارے میں فکرمند ہونے اور اسے وجہ فضیلت سمجھنے کی بجائے باہمی الفت ومحبت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقوشِ پا کی پیروی میں اپنے مشترکہ مقصد کی طرف پیش قدمی کرسکیں۔ وباللہ التوفیق!

اغنیاء کا کردار

ربِّ کائنات کتابِ ہدایت میں ایک طرف مال واَسبابِ دنیوی کی اصل حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿٢٦﴾﴾ (الرعد)

’’اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے‘ سوائے تھوڑے سے فائدے کے۔‘‘

☆ استاذ قرآن اکیڈمی یٰسین آباد‘ کراچی ومقامی امیر تنظیم اسلامی نیو کراچی۔

تو دوسری طرف حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبانی متاعِ دنیوی کو آزمائش کا ذریعہ قرار دیتا ہے:

﴿قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ﴾ (النمل: ٤٠)

’’(سلیمانؑ نے) کہا کہ یہ میرے رب ہی کے فضل سے ہے‘ تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں!‘‘

سیدنا سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد سیدنا داؤد علیہ السلام دونوں اللہ کے برگزیدہ نبی تھے‘ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دُنیوی اعتبار سے سلطنت اور مال ودولت کے عظیم خزانوں سے نوازا تھا۔ لیکن دونوں نے اللہ تعالیٰ کا حقِ شکر ادا کرتے ہوئے اِس مال کو اُس کی رضا کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ معلوم ہوا کہ مال ودولت کی کثرت کوئی بری شے نہیں ہے‘ البتہ اس کے نشے میں غرق ہو کر ربّ العالمین کو بھلا دینا یقیناً گمراہی ہے۔

مادّہ پرستی کا فتنہ

بنی اسرائیل سے بغاوت کرنے والا قارون محض تاریخ کی ایک شخصیت نہیں‘ بلکہ ایک سوچ اور ذہنیت کا نام ہے‘ جو دورِ جدید میں مادّہ پرستی کے فتنہ کی صورت میں پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس طرزِ فکر کا catch phrase قرآن مجید نے قارون کی زبانی یوں واضح کیا ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ﴾ (القصص:٧٨)

’’اس نے کہا کہ مجھے تو یہ سب کچھ ملا ہے اُس علم کی بنیاد پر جو میرے پاس ہے۔‘‘

اس کج فہمی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اللہ کی اس امانت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اللہ کے اختیار اور تصرف کا بالکلیہ انکار کر بیٹھتا ہے‘ اور اس مال کو دوسروں کے مقابلے میں وجہ فضیلت سمجھتے ہوئے اپنی من مانیوں کی صورت میں اس مال کو فساد فی الارض کا ذریعہ بناتا ہے۔ جبکہ خالق ارض وسماء اس تصور کی نفی فرماتے ہوئے قارون کی دولت کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ﴾ (القصص:٧٦)

’’اور ہم نے اس کو خزانے دے رکھے تھے۔‘‘

اور اس سے آگے بڑھ کر تمام اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ہر ایک کو اُس کا رزق عطا فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (البقرۃ:٢٥٤)

''اے اہل ایمان! خرچ کرو اُس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔''

؎ برسماع راست ہر کس چیر نیست طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

قارون کو نصیحت کرنے والے اہل حق کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے صحیح استعمال سے متعلق ہدایات فراہم کیں:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (القصص)

''جب اُس سے کہا اُس کی قوم کے لوگوں نے کہ اترا ؤ مت یقیناً اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس سے آخرت کا گھر حاصل کرنے کی کوشش کرو اور دنیا میں سے اپنا حصہ مت بھولو اور لوگوں کے ساتھ احسان کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے' اور زمین میں فساد مت مچاؤ۔ یقیناً اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

گویا فی نفسہٖ دنیا کا مال و متاع آخرت کے بالمقابل پرِکاہ کی حیثیت نہیں رکھتا' لیکن اس میں انسان کے لیے آزمائش کا بڑا سامان ہے کہ چاہے تو اس کو زمین میں فساد مچانے کا ذریعہ بناتے ہوئے اپنی حقیقی منزل کھوٹی کر دے' اور چاہے تو لوگوں پر احسان اور دینِ حق کی خدمت کر کے اپنے لیے ابدی راحت کا انتظام کر لے۔

مال کی تمنّا کرنا

قارون کے اسی تذکرہ میں مال و دولت کی ریل پیل کی تمنا کرنے والوں کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

﴿فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝﴾ (القصص)

''پھر (ایک دن) وہ نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹ باٹ میں۔ کہا ان لوگوں نے جو خواہش مند تھے دنیا ہی کی زندگی کے' کہ کاش یہ سب کچھ ہمارے لیے بھی ہوتا جو قارون کو ملا ہے' یقیناً وہ بہت بڑے نصیب والا ہے۔ اور کہا ان لوگوں نے جنہیں علم عطا ہوا تھا: افسوس ہے تم پر! اللہ کا عطا کردہ ثواب (اس سے) کہیں بہتر ہے اُس

شخص کے لیے جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے۔ اور وہ بلند مرتبہ نہیں ملے گا مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

ای: جزاء اللّٰہ لعبادہ المؤمنین الصالحین فی الدار الآخرۃ خیر مما ترون .....کما فی الحدیث الصحیح:((یَقُولُ اللّٰہُ تَعَالٰی: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِینَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ، وَاقْرَؤُوا اِنْ شِئْتُمْ: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (السَّجْدَۃِ)(۱)

''یعنی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نیک مؤمن بندوں کے لیے آخرت کی جزا اس سے کہیں بہتر ہے جو تم دیکھ رہے ہو' جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے: ''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر ان کا خیال بھی گزرا''۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ''کسی نفس کو معلوم نہیں کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا چیزیں چھپائی گئی ہیں۔''

اور جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قارون کو نشانِ عبرت بنا دیا' تو انہی تمنا کرنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں' اور انہوں نے کہا:

﴿وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (القصص)

''اور جن لوگوں نے کل اس کے مرتبے کی تمنا کی تھی' اب وہ یوں کہہ رہے تھے: ہائے افسوس! اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق جس کا چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور وہی تنگ کرتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس! کہ کافر بالکل فلاح نہیں پائیں گے۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں:

ای: لیس المال بدال علی رضا اللّٰہ عن صاحبہ (و عن عبادہ) فان اللّٰہ یعطی ویمنع' ویضیق ویوسع' ویخفض ویرفع' ولہ الحکمۃ التامۃ و الحجۃ البالغۃ.....

(۱) مسند احمد، بَاقِي مُسْنَدِ الْمُكْثِرِينَ، مُسْنَدُ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔

وھذا کما فی الحدیث المرفوع عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ : ((اِنَّ اللّٰهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَخْلَاقَكُمْ، كَمَا قَسَمَ أَرْزَاقَكُمْ، وَاِنَّ اللّٰهَ يُعْطِي الْمَالَ مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ، وَلَا يُعْطِي الْاِيْمَانَ اِلَّا مَنْ يُحِبُّ))(۲)

''یعنی: مال کا دیا جانا اللہ تعالیٰ کی (اپنے بندوں پر) رضا کا مظہر نہیں ہے' پس اللہ تعالیٰ جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روکے' جسے چاہے تنگی دے اور جسے چاہے وسعت دے' جسے چاہے پست کرے اور جسے چاہے بلند کرے' اور اس کی حکمت تام ہے اور حجت مکمل ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث میں وارد ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ مال اسے بھی عطا فرماتا ہے جس سے وہ محبت فرماتا ہے اور اسے بھی جس سے وہ محبت نہیں فرماتا' لیکن ایمان اُسی کو عطا فرماتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔''

اسی مضمون کو ایک اور انداز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ (النساء: ۳۲)

''اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔''

اس آیت کی تشریح میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس آیت میں بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے' جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوب صورت ہے اور کوئی بدصورت۔ کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز۔ کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ کوئی سلیم الاعضاء ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی ساری گونا گونی قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک نوعیت کا فساد رونما ہوتا ہے' اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' وہاں ایک دوسری نوعیت کا فساد برپا ہوتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی

(۲) مسند احمد، مسند المکثرین من الصحابة، مسند عبد اللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه عنه

حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے' بے چین ہو جائے' یہی اجتماعی زندگی میں رشک' حسد' رقابت' عداوت' مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے' اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا' اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو' البتہ اللہ سے فضل کی دعا کرو' وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمہارے لیے مناسب سمجھے گا عطا فرما دے گا۔''

اغنیاء کی فضیلت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لیے ہر اعتبار سے مشعلِ راہ اور راہنما ہیں۔ ان کی جماعت میں جہاں اصحابُ الصُّفّہ رضی اللہ عنہم جیسے درویش صفت بندگانِ خدا تھے' وہیں اغنیاء میں سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف جیسے مبشّر اصحاب بھی تھے۔ لیکن فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان اہلِ ثروت اصحاب کے مال کی کبھی تمنا نہیں ہوئی' بلکہ ان کی اصل ترجیحات مندرجہ ذیل مشہور روایت سے ظاہر ہوتی ہیں:

أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ أَتَوْا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالُوا: ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى وَالنَّعِيمِ الْمُقِيمِ، فَقَالَ: ((وَمَا ذَاكَ؟)) قَالُوا: يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ وَلَا نَتَصَدَّقُ، وَيُعْتِقُونَ وَلَا نُعْتِقُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((أَفَلَا أُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا تُدْرِكُونَ بِهٖ مَنْ سَبَقَكُمْ، وَتَسْبِقُونَ بِهٖ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَلَا يَكُونُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ اِلَّا مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ؟)) قَالُوا: بَلٰى يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: ((تُسَبِّحُونَ وَتُكَبِّرُونَ وَتَحْمَدُونَ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ مَرَّةً)) قَالَ أَبُو صَالِحٍ: فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ اِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالُوا: سَمِعَ اِخْوَانُنَا أَهْلُ الْأَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا، فَفَعَلُوا مِثْلَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ))(۳)

''مہاجرین میں سے نادار افراد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ مالدار لوگ اعلیٰ درجے اور ہمیشہ کی نعمتوں میں چلے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ کیسے؟'' انہوں نے عرض کیا کہ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں' اور وہ بھی روزہ رکھتے ہیں جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں' لیکن وہ صدقہ دیتے ہیں

(۳) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذکر بعد الصلاة وبیان صفت...

اور ہم صدقہ نہیں دے سکتے' وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم غلام آزاد نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں کوئی ایسی چیز نہ سکھاؤں کہ جو تم سے سبقت لے گئے ہیں تم انہیں پالو اور اپنے بعد والوں سے آگے بڑھ جاؤ اور کوئی تم سے افضل نہ ہو سوائے اس کے کہ جو تمہاری طرح کرے؟'' انہوں نے عرض کیا: ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ! فرمایئے! آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پڑھا کرو''۔ راویٔ حدیث ابوصالح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مہاجرین فقراء دوبارہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ ہمارے مالدار بھائیوں نے بھی یہ سن لیا ہے اور وہ بھی اسی طرح کرنے لگے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔''

غور فرمایئے' مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کو اہل ثروت اصحاب کے مال کی پروا اور تمنا نہیں تھی' بلکہ ان کو پریشانی اس بات کی تھی کہ اس مال کے ذریعے اصحابِ فضل جو درجات حاصل کر رہے ہیں (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے انفاق کے ذریعہ متعدد مرتبہ لسانِ نبوت سے جنت کی بشارت حاصل کرتے رہے)' ان درویشوں کے پاس قلتِ مال کی وجہ سے اس کا موقع میسر نہیں۔

مزید برآں ایک شاکر غنی کی فضیلت کو نبی اکرم ﷺ نے یوں بھی بیان فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ((لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَقَامَ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ، وَرَجُلٌ اَعْطَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يَتَصَدَّقُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ))(٤)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''کسی شخص پر رشک کرنا' سوائے دو شخصوں کے' جائز نہیں: ایک وہ شخص جسے اللہ نے کتاب دی اور وہ اٹھ کر اسے رات کو پڑھتا ہے اور ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ دن رات اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی ہر خدمت کی بنیاد میں اہلِ علم اور اہلِ ثروت افراد کا کردار ہوا کرتا ہے۔ علم کی ترویج اور اس کی بنیاد پر معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اہلِ ثروت حضرات اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے اُس کی راہ میں خرچ کریں' اور عنداللہ درجاتِ عالیہ حاصل کریں۔

(٤) صحيح البخاری' كتاب فضائل القرآن' باب اغتباط صاحب القرآن۔

مندرجہ بالا آیات و احادیث کا رکنانِ تحریکاتِ دینیہ کے لیے بھی لائق توجہ ہیں۔ تحریکی جدوجہد کے دوران مختلف ذمہ داریاں ایسے اہل افراد کے سپرد بھی کی جاتی ہیں جو تقویٰ اور دین داری میں بھی ترقی کر رہے ہوں اور اِنفاقِ جان و مال میں بھی آگے بڑھ رہے ہوں۔ کسی کا مالدار اور متمول ہونا کسی دینی تحریک میں ذمہ داری پر فائز کیے جانے کے لیے اسے نااہل نہیں بنا دیتا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ دوسری طرف خدمتِ دین کے ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن مجید جہاں بھی جہاد فی سبیل اللہ کا تذکرہ فرماتا ہے' جہاد بالمال اور جہاد بالنفس دونوں کو بیان فرماتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ جہاں اپنی راہ میں انفاقِ مال کا تقاضا فرماتے ہیں' وہیں بذلِ نفس کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک طرزِ فکر یہ بھی ہے کہ دینی کاموں کے لیے چندہ تو خوب دیا جا رہا ہے' لیکن خود اپنی زندگی کو قرآن و سنت کی رہنمائی کے مطابق بدلنے میں کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا جا رہا۔ ایسے لوگوں کو محض ان کی مالی حیثیت کی بنا پر اہمیت دینا تو کجا ان کے مال کی طرف نگاہ کرنا بھی دین کے لیے نقصان کا باعث ہوگا' برعکس ان اغنیاء کے جو اصلاحِ احوال اور انفاقِ مال و جان کا صدقِ دل سے اہتمام کرتے ہیں۔

نبی مکرم ﷺ کا اُسوہ: حُبّ المساکین

مندرجہ بالا سطور میں دین دار اہل ثروت کی عنداللہ فضیلت کے ضمن میں چند پہلو پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن قرآن مجید اور سنتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہمارے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کرتے ہیں' جہاں کم مالی حیثیت والے دین کے علمبردار افراد کا بارگاہِ الٰہی میں عالی مقام اور جناتِ نعیم میں ان کے بآسانی داخلے کا بیان ملتا ہے۔ کلامِ الٰہی مال کے دیے جانے کو آزمائش سے تعبیر کرتا ہے' اور ساتھ ہی مال و متاعِ دنیوی کے روک دیے جانے یا واپس لے لیے جانے کو بھی ایک آزمائش بتاتا ہے:

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿١٦﴾ كَلَّا .....﴾ (الفجر)

''مگر انسان بھی عجب شئے ہے کہ جب آزماتا ہے اسے اس کا رب یعنی اس کو عزت دیتا ہے اور اس پر انعام فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب اس کو یوں آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے

مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہے.....''

غور فرمایئے کہ دونوں صورتوں میں آزمائش اور ابتلاء کے الفاظ آئے ہیں۔ چنانچہ مال کا ہونا یا نہ ہونا ربّ العالمین کی رضا یا ناراضی کی علامت ہرگز نہیں' بلکہ جہاں مالداروں کو ان کے مال کے ذریعہ آزمایا جا رہا ہے' وہیں نادار افراد کو ان کی ناداری میں آزمایا جا رہا ہے۔ نصوصِ دینیہ کا گہرا مطالعہ اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے کہ مال دے کر آزمایا جانا باری تعالیٰ کی جانب سے زیادہ سخت آزمائش ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِثْنَتَانِ يَكْرَهُهُمَا ابْنُ آدَمَ وَهُمَا خَيْرٌ لَّهُ: اَلْمَوْتُ، وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِّلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتْنَةِ، وَيَكْرَهُ قِلَّةَ الْمَالِ، وَقِلَّةُ الْمَالِ أَقَلُّ لِلْحِسَابِ))(۵)

''ابن آدم دو چیزوں کو ناپسند کرتا ہے جبکہ وہ دونوں اس کے حق میں خیر ہیں: ایک موت' جبکہ موت مؤمن کے لیے فتنے سے بہتر ہے' اور مال کی قلت کو ناپسند کرتا ہے' جبکہ مال کی کمی حساب کے اعتبار سے ہلکی چیز ہے۔''

اور بقول حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے **حرامها عقاب وحلالها حساب** 'مال میں حرام موجب سزا ہے اور حلال موجب حساب ہے۔''(۶)

ہمارے اسلاف کا طرزِ عمل بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ امام اہل السنہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فتنہ خلقِ قرآن کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے پر جتنا ستایا گیا اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا' انہوں نے اس سب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ لیکن رہائی کے بعد اگلے خلیفہ نے جب اشرفیاں خدمت میں پیش کیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کہ اس آزمائش میں سرخرو ہونا پہلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔

احادیثِ مبارکہ کے مطابق اصحابِ مال کے مقابلے میں نادار صلحاء کا حساب کہیں زیادہ آسان ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((يَدْخُلُ الْفُقَرَاءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْأَغْنِيَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ))(۷)

''فقراء' مالداروں سے ۵۰۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔''

الغرض کتبِ سماویہ میں زہد کا موضوع مرکزی حیثیت کا حامل ہوا کرتا ہے' قناعت اور

(۵) مسند احمد، بَاقِي مُسْنَدِ الْأَنْصَارِ، حَدِيثُ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔

(۶) احياء علوم الدين، كتاب رياضة النفس وتهذيب الأخلاق ومعالجة أمراض القلب۔

(۷) سنن الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء أن فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل أغنيائهم۔

آخرت کی فکر کرنے کو مطلوبہ صفات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اہلِ ثروت افراد کی اہمیت کی نفی کیے بغیر اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ اسلامی معاشروں میں نمونے اور آئیڈیل کے طور پر ہمیشہ زاہدوں اور عابدوں کو پیش کیا جاتا رہا' جس کی سب سے بڑی مثال خود سید المرسلین وخاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات اور اہل خانہ کے لیے فقر کو اختیار فرمایا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گواہی ہے کہ:

مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ ﷺ مِنْ خُبْزِ شَعِيرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ(۸)

''آپ ﷺ کے گھر والے کبھی لگاتار دو دن جو کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اس فانی دنیا سے رحلت فرما گئے۔''

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا:

((عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا، قُلْتُ: لَا يَا رَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَأَجُوْعُ يَوْمًا، وَقَالَ ثَلَاثًا اَوْ نَحْوَ هٰذَا، فَإِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ إِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ، وَإِذَا شَبِعْتُ شَكَرْتُكَ وَحَمِدْتُكَ))(۹)

''میرے رب نے میرے لیے وادیٔ بطحا کو سونا بنانے کی پیشکش کی۔ میں نے عرض کیا: نہیں اے میرے رب! بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دوسرے دن بھوکا رہوں —— یا فرمایا: تین دن تک یا اسی طرح کچھ فرمایا —— اس لیے کہ جب میں بھوکا رہوں تو تجھ سے التجا کروں اور عجز وانکساری بیان کرتے ہوئے تجھے یاد کروں اور جب سیر ہو جاؤں تو تیرا شکر اور تعریف وتحمید کروں۔''

نبی مکرم ﷺ کی ترجیحات کا اظہار سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل روایت سے بھی ہوتا ہے:

وَإِنَّهُ ﷺ لَعَلٰى حَصِيْرٍ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ شَيْءٌ، وَتَحْتَ رَأْسِهِ وِسَادَةٌ مِنْ أَدَمٍ حَشْوُهَا لِيفٌ، وَإِنَّ عِنْدَ رِجْلَيْهِ قَرَظًا مَصْبُوبًا، وَعِنْدَ رَأْسِهِ أَهَبٌ مُعَلَّقَةٌ، فَرَأَيْتُ أَثَرَ الْحَصِيرِ فِيْ جَنْبِهِ فَبَكَيْتُ، فَقَالَ: ((مَا يُبْكِيْكَ؟)) فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ كِسْرٰى وَقَيْصَرَ فِيمَا هُمَا فِيهِ، وَأَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ! فَقَالَ: ((أَمَا تَرْضَى أَنْ تَكُوْنَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةُ؟))(۱۰)

(۸) صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق۔

(۹) سنن الترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی الكفاف والصبر عليه۔

(۱۰) صحيح البخاری، كِتَاب تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، سورة التحريم' بَاب تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكَ۔

''آپ ﷺ ایک بوریے پر لیٹے ہوئے تھے' آپؐ کے جسم اور بوریے کے درمیان کچھ نہ تھا' اور آپ کے سر کے نیچے چمڑے کا ایک تکیہ تھا جس میں کھجور کی چھال بھری تھی اور پاؤں کے پاس گھاس کے پتوں کا ڈھیر تھا' اور سر کے پاس کچے چمڑے لٹکے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کے پہلو میں بوریے کا نشان دیکھا تو میں رو پڑا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم کیوں روتے ہو؟'' میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! قیصر وکسریٰ تو کس طرح آرام میں زندگی گزارتے ہیں اور آپ اللہ کے رسول ہو کر اس حالت میں ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت ہو!''

مسلمانوں کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اگر بادشاہوں اور امراء نے لوگوں کے اجسام پر حکومت کی ہے تو اولیاء کرام اور صالحین عظام رحمہم اللہ نے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی ہے' اور ان اتقیاء نے فقر وفاقے کی زندگی ہی گزاری ہے۔ ؎

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شاہ سوار
حاملِ خلقِ عظیم صاحبِ صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!

اسی گروہ کے بارے میں نبی محترم ﷺ کو حکم دیا گیا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾﴾ (الکھف)

''اور اپنے آپ کو روکے رکھیے ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح وشام' وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں' (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپ دنیوی زندگی کی آرائش وزیبائش چاہتے ہیں! اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔''

اس ارشادِ ربانی کی وضاحت میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مندرجہ ذیل حدیث مبارکہ نقل فرماتے ہیں:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ: نَزَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَهُوَ

فِيْ بَعْضِ أَبْيَاتِهِ: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ فَخَرَجَ يَلْتَمِسُهُمْ، فَوَجَدَ قَوْمًا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى، مِنْهُمْ ثَائِرُ الرَّأْسِ وَجَافِي الْجِلْدِ وَذُو الثَّوْبِ الْوَاحِدِ، فَلَمَّا رَآهُمْ جَلَسَ مَعَهُمْ وَقَالَ: ((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ أَمَرَنِي اللّٰهُ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِي مَعَهُمْ)) (۱۱)

''عبدالرحمٰن بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ اتری' آپؐ اپنے کسی گھر میں تھے تو آپ اسی وقت ایسے لوگوں کی تلاش میں نکلے۔ کچھ لوگوں کو ذکر اللہ میں پایا جن کے بال بکھرے ہوئے تھے' کھالیں خشک تھیں' بمشکل ایک ایک کپڑا انہیں حاصل تھا۔ آپ ﷺ فوراً ان کی مجلس میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ رکھے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔''

بقول شاعر ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مؤمن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی ونوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگاہ دل نواز

دیگر روایات میں اس مجلس کے شرکاء کا بھی بیان ہے جن میں حضرت بلال' حضرت خباب' حضرت عمار اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہم شامل ہیں' جو سب کے سب مکہ کے کمزور طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان مجالس کا اختیار کرنا صرف نبی رحمت ﷺ ہی کا شیوہ نہ تھا' بلکہ آپ ﷺ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی مجالس بھی انہی درویشوں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ سیدنا نوح علیہ السلام سے ان کی قوم کے سرداروں کا مکالمہ قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے:

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا

(۱۱) تفسیر ابن کثیرؒ، فی آیۃ: و اصبر نفسک.....

تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾﴾ (ھود)

''تو اس کی قوم کے ان سرداروں نے کہا جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی کہ ہم نہیں دیکھتے (اے نوح علیہ السلام) آپ کو مگر اپنے جیسا ایک انسان' اور ہم نہیں دیکھتے مگر یہ کہ آپ کی پیروی کرنے والے بظاہر ہم میں ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں' اور ہمیں نظر نہیں آتی اپنے مقابلے میں تم لوگوں میں کوئی بھی فضیلت' بلکہ ہمارا گمان تو یہی ہے کہ تم لوگ جھوٹے ہو۔ نوح علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! ذرا غور کرو' اگر میں (پہلے سے ہی) اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر تھا اور (اب) اس نے مجھے اپنے پاس سے خاص رحمت بھی عطا فرما دی ہے (اور یہ وہ چیز ہے) جس کو تمہاری نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے تو کیا ہم چپکا دیں تم پر اس کو (زبردستی) جبکہ تم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہو؟ اور اے میری قوم کے لوگو! میں تم سے اس کے بدلے کوئی مال طلب نہیں کرتا' میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے' اور جو لوگ ایمان لائے ہیں میں ان کو دھتکارنے والا بھی نہیں ہوں' وہ یقیناً اپنے رب سے ملنے والے ہیں' لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو گئے ہو۔ اور اے میری قوم کے لوگو! (ذرا سوچو کہ) اگر میں ان کو اپنے ہاں سے بھگا دوں گا تو کون میری مدد کرے گا اللہ کے مقابلے میں' تو کیا تم لوگ نصیحت اخذ نہیں کرتے؟ اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں ان لوگوں کے بارے میں جنہیں تمہاری آنکھیں حقیر دیکھ رہی ہیں کہ اللہ انہیں کوئی خیر نہیں دے گا' اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے' (اگر میں ان کو دور کر دوں) تب تو یقیناً میں خود ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔''

اسی بات کو واضح کرتے ہوئے قیصر روم ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے قبل ایک مکالمے میں ان سے کہا:

وَسَاَلْتُكَ اَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ اَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ؟ فَذَكَرْتَ اَنَّ ضُعَفَائُهُمْ اتَّبَعُوْهُ وَهُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ (۱۲)

''اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا لوگوں میں سے معزز لوگوں نے اس کی پیروی کی یا

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی' باب بدء الوحی۔

کمزوروں نے؟ تو تم نے کہا کہ بے شک کمزوروں نے اس کی پیروی کی' اور یہی لوگ رسولوں کی پیروی کرتے ہیں۔''

ایک اور روایت میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا:

عَنْ حَارِثَةَ بْنَ وَهْبٍ الْخُزَاعِيَّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: ((أَلَا اُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعَّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ)) (۱۳)

''حارثہ بن وہب خزاعی روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''کیا میں تمہیں اہل جنت کی خبر نہ دوں؟ وہ ہر کمزور اور حقیر سمجھا جانے والا ہے' کہ اگر وہ اللہ پر کوئی قسم کھالے تو اللہ اس کو پورا کر دے۔''

چنانچہ تحریکاتِ دینیہ میں مالدار افراد کو مالی اعتبار سے کم حیثیت رکھنے والے باصلاحیت ساتھیوں کے آگے بڑھنے اور ذمہ داریاں سنبھالنے پر اعتراض کرنے کی بجائے ان کے جذبہ دینی کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

حرفِ آخر

اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ آیات واحادیث کی روشنی میں دینی تحاریک میں موجود افراد کے مابین معاشی فرق وتفاوت کی حقیقت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کا دین کی نگاہ میں مقام ومرتبہ بھی بیان کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں بھی ہمیں معاشی طبقاتی فرق نظر آتا ہے' لیکن اس کے باوجود ان کی باہمی محبت ومودت اس درجے کی تھی کہ اس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ غنی شاکر اپنی ذات میں افضل ہے نہ فقیر صابر' بلکہ عنداللہ افضلیت کی بنیاد تقویٰ ہے ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)' لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر ایک مقامِ فضیلت پا سکتا ہے بشرطیکہ دل میں تقویٰ وللّٰہیت پیدا کی جائی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے ساتھ خلوص اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم تقدیر الٰہی پر راضی رہتے ہوئے اس حقیقت کا ایقان حاصل کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جسے فراخی عطا کی ہے تو وہ بھی آزمانے کی غرض سے کہ بندہ شکر کرتا ہے یا نہیں' اور جس کو نپا تلا دیا ہے تو وہ بھی آزمائش کی خاطر کہ بندہ صبر کی روش اختیار کرتا ہے یا نہیں۔ اور دونوں حالتیں بندہ مؤمن کے لیے خیر کا موجب ہیں۔ حدیثِ رسول ﷺ میں اس حقیقت پر

(۱۳) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب عتل بعد ذلك زنیم۔

سے نقاب کشائی یوں کی گئی ہے:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ))(١٤)

''بندۂ مؤمن کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ اس کے ہر حال میں خیر ہی خیر ہے' اور یہ بات سوائے بندہ مؤمن کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے' کہ اگر اسے کوئی نعمت ملی تو اس نے شکر ادا کیا تو اس کے لیے اس میں ثواب ہے' اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچا اور اس نے صبر کیا تو اس کے لیے اس میں بھی ثواب ہے۔''

تحریکی ساتھیوں کے لیے ضروری ہے کہ مالی فرق و تفاوت سے نظریں ہٹا کر رضائے الٰہی کے حصول کی نیت سے اپنی تمام تر صلاحیتیں دین متین کی خدمت میں صرف کر دیں' اور دارِفانی کے مقابلے میں دارِخلد کو ترجیح دیتے ہوئے جناتِ نعیم میں اعلیٰ درجات کے حصول کو مقصدِ حیات بنائیں۔ اللہ ربّ العزت ہمیں فکر و عمل میں معتدل روش اپنانے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین! ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی!

(١٤) صحيح مسلم، كتاب الزهد و الرقاق، باب المؤمن امره كله خير۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کامیابی کُل کے کُل دین میں ہے!

ڈاکٹر ضمیر اختر خان ☆

اکثر مساجد میں نماز کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے: ''میری' آپ کی بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کی کامیابی اللہ پاک نے کل کے کل دین میں رکھی ہے۔ ہم سب کی زندگیوں میں پورے کا پورا دین کس طرح آئے گا' اس کے لیے زبردست محنت کی ضرورت ہے''۔ ایک اعلان یہ بھی کیا جاتا ہے: ''ہم سب کی کامیابی اللہ کے حکموں کو ماننے اور نبی ﷺ کے طریقوں پر چلنے میں ہے۔''

یہ اعلان کرنے والے نہ کوئی بڑے عالم فاضل ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی بڑے دانشور۔ یہ سادہ اور بالکل درست اعلان کرنے والے عام لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اسی فکر کے تحت اپنا وقت' جان و مال لگا کر اپنے گھروں سے' گرم و سرد موسم کی پرواہ کیے بغیر' اس اعلان کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ قابل رشک ہیں۔ ہمیں ان کے خلوص اور اخلاص میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان سطور کے ذریعے ''کل کے کل دین'' اور ''اللہ کے حکموں اور نبی ﷺ کے طریقوں'' کی وضاحت کی جائے گی۔ مقصد اس عظیم کام کو درست طریقے سے کرنے کی راہیں متعین کرنا ہے تاکہ مخلصین کی محنت کے ثمرات بھی سامنے آئیں' جس طرح صحابہ کرام رضون اللہ علیہم اجمعین کی محنت کے ثمرات اس عظیم الشان خلافت کے قیام کی صورت میں سامنے آئے تھے' جس کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

قرآن وسنت کے مطالعہ سے دین کے تین مطالبات بالکل واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد سب سے پہلا مطالبہ انفرادی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کا بندہ بننا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہونا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾ ''دین میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ!'' یعنی مکمل طور پر دین کو اختیار کرو۔

☆ zamirakhtarkhan@yahoo.com

گویا انسان عقائد' عبادات' سماجی رسومات' معاشرت' معیشت اور سیاست ہر جگہ اللہ کے حکموں کو پیش نظر رکھے۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے احکام اور رسول ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری اختیار کرے۔ زندگی کا کوئی گوشہ بھی اللہ کے احکام سے خالی نہ ہو۔ قرآن مجید بتکرار یہ حکم دیتا ہے: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی''۔ اطاعت میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایک اوامر یعنی جن باتوں کے کرنے کا حکم ہے' ان کو بجا لانا اور دوسرے نواہی یعنی جن امور سے اللہ اور رسول ﷺ نے منع کیا ہے' ان سے رُک جانا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ نیکی کرنے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی برائی میں ملوث رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم پر عمل ہو رہا ہے اور دوسرے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف یہ کہ ایمان کے منافی ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۸۵)

''کیا تم کتاب کے ایک حکم کو مانتے ہو اور دوسرے کا انکار کرتے ہو؟ پس جو کوئی تم میں ایسا کرے گا تو اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کو دنیا میں رسوا کیا جائے گا اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔''

نیکیوں اور معروفات پر عمل کرنا اور منکرات سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے جو کہ دنیا و آخرت میں کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ وہ طرزِ عمل جس میں پورے کے پورے اسلامی احکام کی فرماں برداری ہو' جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت شعاری ہو' جس میں معروف کے اختیار کرنے اور منکر سے بچنے کا اہتمام ہو' ایسا طرزِ عمل عبادت و بندگی کہلاتا ہے اور یہی تمام انسانوں کی تخلیق کا بنیادی مقصد ہے۔ اس رویے کو مستحکم کرنے کے لیے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کا التزام کیا جاتا ہے تاکہ انسان کے اندر استقامت پیدا ہو سکے۔

انسان کے اس بندگی والے رویے کو اپنانے میں تین قوتیں رکاوٹ بنتی ہیں۔ پہلی قوت انسان کے اندر نفس امارہ ہے۔ دوسری قوت خارج میں شیطان لعین ہے اور تیسری طاقت جاہلی رسم و رواج پر مشتمل معاشرہ ہے' جس کے دباؤ کے آگے ڈٹ جانا ہوتا ہے۔ ان تینوں رکاوٹوں

کو عبور کرنے کے لیے ایک زبردست محنت کی ضرورت ہے' جسے قرآن کی اصطلاح میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کہتے ہیں۔ یہ جہاد اوّلاً نفس کی تمام چالوں کے خلاف کرنا ہوتا ہے۔ ثانیاً شیطان رجیم کے خلاف کرنا پڑتا ہے اور ثالثاً پورے معاشرے کے خلاف کرنا ہوتا ہے۔ اس جہاد کا آلہ قرآن مجید فرقان حمید ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا پڑھنا' سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اور اس کی دعوت کو عام کرنا' اس جہاد کے لیے بمنزلہ ہتھیار ہے۔ اسی کی تلاوت سے اپنے نفس کو قابو کرنا ہے۔ اس کی سمجھ بوجھ سے شیطان کی تمام چالوں کا مقابلہ کرنا ہے اور اسی کی تعلیمات کے ذریعے معاشرے کی جہالت کا علاج کرنا ہے۔

وہ حضرات جو کل کے کل دین پر چلنے کا عزم رکھتے ہیں' ان کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن مجید سے ایسا تعلق قائم کریں جیسا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائم کیا تھا۔ ان کی راتیں قرآن کے ساتھ بسر ہوتی تھیں' جس کا نقشہ قرآن نے یوں کھینچا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ﴾ (المزّمل: ۲۰)

''(اے نبی ﷺ) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی (صحابہ کرامؓ) دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات قیام کیا کرتے ہو۔''

مرکز و محور کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہو۔ البتہ دین کے عمومی فہم کے لیے علماء کی کتب سے استفادے کی ممانعت نہیں' لیکن ایسا نہ ہو کہ قرآن کی طرف التفات کم ہو جائے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ روزانہ کی تعلیم میں ساری توجہ انہی ثانوی کتب پر مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے۔ علمائے کرام نے قرآن مجید کے فہم اور روزانہ تعلیم کے لیے 'درس قرآن' کے عنوان سے سادہ اور عام فہم تفاسیر بھی لکھی ہیں تاکہ ایک عام خواندہ آدمی بھی قرآن کی تعلیم کا آسانی سے اہتمام کر سکے۔

یہ سوچ کہ قرآن سے استفادہ کرنے کے لیے بہت بڑا عالم ہونا ضروری ہے' درست نہیں ہے۔ قرآن سے احکام اور مسائل کا استنباط کرنے کے لیے تو یقیناً عالم ہونا ضروری ہے مگر اس سے یاد دہانی یعنی تذکر اور ایسی سمجھ حاصل کرنا جس سے انسان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان مضبوط ہو' آخرت کی یاد دہانی اور خوف پیدا ہو اور قلب و روح کا تزکیہ ہو تو یہ ہر مسلمان بلکہ ہر انسان حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لیے ایک ہی سورت' سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ یہ فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾

''ہم نے یقیناً قرآن کو یاد دہانی اور سمجھ کے لیے آسان کر دیا ہے' تو کوئی ہے جو کہ سوچے' سمجھے!''

دین کا دوسرا مطالبہ دعوت الی اللہ ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے رسول بھیجے۔ سب سے آخر میں محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ پر نبوت و رسالت مکمل ہو کر ختم ہو گئی۔ آپ ﷺ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ ذمہ داری امت کے حوالے کر گئے۔ خود اللہ جل شانہ نے بھی مسلمانوں کو خیر امت ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ اور امت وسط ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ قرار دے کر یہ کام ان کے ذمہ لگایا کہ اب ساری انسانیت کو اسلام کا پیغام پہنچانا ایک ایک فردِ مسلم کی اپنی صلاحیت اور ہمت کے مطابق ذمہ داری ہے۔ آغاز گھر سے ہو گا تاکہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ (جو سب سے زیادہ قریب ہے وہ پہلا حقدار ہے) کا تقاضا پورا ہو۔ اس کام میں ایک طرف دعوت الی اللہ ہے تو دوسری طرف تبلیغ دین ہے' اور اسی کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے۔ اور بالآخر اپنے حلقۂ اثر میں دین کا گواہ بننے کے علاوہ اتمامِ حجت بھی کرنی ہے۔ یہ سب اس لیے کرنا ہے تاکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فریضۂ شہادتِ حق ادا ہو جائے اور آخری عدالت میں سرخروئی ہو جائے اور لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں پیش کرنے کے لیے کوئی حجت و دلیل نہ رہے۔

دعوتِ دین کا کام بھی مسلسل محنت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس جہاد میں مخالفینِ اسلام کے مقابلے کے لیے ''جدالِ احسن'' کا حکم ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے دعوتِ اسلام کو نہیں مانتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ بھی کرنا پڑتا ہے مگر نہایت ہی اچھے اور شائستہ طریقے سے تاکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہر معاشرے میں ذہین و فطین لوگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود معاشرے میں زیادہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں' ان کو دین کی دعوت حکمت اور دانائی کے ساتھ اور عقل و منطق کے ساتھ دی جائے گی تاکہ یہ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کریں۔ اسی طرح معاشرے میں ایک کثیر تعداد سادہ لوح انسانوں کی ہوتی ہے' ان کو دل سوزی اور ہمدردی و اخلاص کے ساتھ دعوت دی جائے تو یہ اسلام کی فطری تعلیمات کو قبول کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ ان کو قرآن کے موعظۂ حسنہ کے ذریعے اسلام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور اس جہاد میں ہتھیار تلوار نہیں اللہ کا کلام قرآن مجید فرقان حمید ہے۔

دین کا تیسرا مطالبہ اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرنا ہے۔ دین اسلام ایک نظامِ زندگی ہے' لہٰذا مسلمانوں کی معاشرت' معیشت اور سیاست بھی دین کے تابع ہو۔ اگر انفرادی سطح پر ایک شخص اللہ کی بندگی کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس کا حق ادا کر سکے جبکہ اجتماعی نظام اللہ کی بندگی والا نہ ہو۔ اگر معاشرت میں اللہ کے حکموں کو پیش نظر نہ رکھا جائے' بے حیائی' فحاشی و عریانی عام ہو' مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ہو' محرم و نامحرم کی تمیز نہ رہے' رشتوں ناتوں کا پاس ولحاظ نہ ہو' ذات پات اور سماجی اونچ نیچ کا چلن ہو..... اگر معیشت میں ناہمواری ہو' سودی کاروبار ہو' جاگیرداری اور سرمایہ داری کا دور دورہ ہو' معاش کمانے کے مواقع نہ ہوں' حصولِ معاش میں حلال وحرام کا فرق مٹ جائے' جوئے سٹے اور دیگر کاروبار کی کھلی چھوٹ ہو تو ایسے میں ایک فرد کا انفرادی حیثیت میں دین پر چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر سیاسی سطح پر اللہ کی حاکمیت کی بجائے عوام یا کسی فرد کی حکمرانی قائم ہو اور اللہ کے احکام کی بجائے اپنے وضع کردہ قوانین رائج ہوں' عدالتوں میں شرعی قوانین کی بجائے غیروں کے قوانین کی پیروی کی جارہی ہو تو ایسے میں بھی اللہ کی بندگی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ کل کے کل دین کا صحیح مفہوم سمجھ کر اس کے لیے جدوجہد کی جائے تاکہ دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل ہو۔

دین کے اس تیسرے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے انتہائی درجے کی محنت درکار ہے۔ یہ محنت ایک انسان اکیلے نہیں کرسکتا بلکہ اس کے لیے ایک ''حزب اللہ'' کی تشکیل شرطِ لازم ہے۔ جب تک نبی ﷺ کی قائم کردہ جماعت یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرز پر ایک جماعت وجود میں نہیں آتی' اس وقت تک دین کا یہ مطالبہ ہرگز پورا نہیں ہوسکتا۔ اس سطح پر جماعتی محنت اور جدوجہد کو قرآنی اصطلاح میں 'قتال فی سبیل اللہ' قرار دیا گیا ہے۔ اس مرحلے پر باطل نظام کے ماننے والوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور جان تک کی قربانی کا معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اللہ کا حکم ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال: ٦٠) ''اور ان کے مقابلے کے لیے تیاری کرو جتنی تمہاری ہمت ہے'' پیش نظر رکھ کر بھرپور تیاری کے ساتھ ہر طرح کی مادّی قوت کا استعمال کرکے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جیسی کامیابی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاصل کی تھی۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ کامیابی کل کے کل دین کو اختیار کرنے میں ہے۔ کل دین سے

مراد انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کے حکموں کو اس طرح جاری کرنا ہے کہ کوئی گوشۂ زندگی دین سے باہر نہ ہو۔ قرآن وسنت ہمارے لیے دستورِ حیات ہیں۔ انہی کی روشنی میں ہمارے جملہ معاملات طے پائیں۔ جس طرح عبادات میں قرآن وسنت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' اسی طرح معاش ومعاشرت اور حکومت وریاست میں بھی قرآن وسنت کو ہی راہ نما مانا جائے اور عملاً اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کل کے کل دین پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

بقیہ: قرآن کریم کی اصولی باتیں

وہ چھوڑتا ہے وہ اللہ کی اطاعت میں کر رہا ہوتا ہے اور اپنے عظیم رب کے سامنے اپنی عبودیت کا فرض ادا کر رہا ہوتا ہے' اب وہ بندہ اس پر کیسے مطمئن ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت ایسے دین کے ساتھ کرے جس کی بنیاد ''نفس پرستی'' ہو!

اس عظیم اصول پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

پہلی بات: جن شرعی مسائل میں اہل علم کے درمیان معروف ومشہور فقہی اختلاف پایا جاتا ہے اس قاعدے اور اصول کو وہاں چسپاں کرنے سے احتیاط کی جائے۔

دوسری بات: یہاں جو بات قابل مذمت ہے وہ فتویٰ دریافت کرنے میں خواہش نفس کی پیروی کرنا ہے کہ آدمی اہلِ فتویٰ علماء کے درمیان چکر لگاتا رہے' اگر ایک عالم کا فتویٰ اس کی مرضی کے مطابق ہوا تو اسے مان لیا' ورنہ دوسرے عالم کے پاس چلا گیا۔ اسی طرح عالموں کے درمیان گھومتا رہے حتیٰ کہ اپنی مرضی کا فتویٰ پالے۔ اسی کو کہتے ہیں خواہش نفس کی پیروی کرنا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے نفس پرستی کے شر سے پناہ چاہتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں حق کا پیروکار بنائے اور وہی ہماری منزل ہو۔

(جاری ہے)

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۳)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور اباجی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اباجی کی دستیاب یادداشتوں میں قیام کوئٹہ کے دوران' مجسم انقلاب' مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے حوالے سے پہلی تحریر ۱۴؍جون ۱۹۵۳ء کو یوں ملتی ہے: (مولوی عرض محمد صاحبؒ و دیگر شرکاء) ان سے بھی دینی خدمت اور معاشرہ کے قیام پر تبادلۂ خیالات ہوا..... مولانا عبیداللہ سندھی کا طریق کار' زمین میں سے روئیدگی نکالنے کا بیان کیا۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ مع خدام ہندوستان سے لاہور میں صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر رونق افروز ہوئے۔ اباجی کی بھی حسب معمول حاضری شروع ہوگئی۔ ۲۷؍مارچ بعد از نماز مغرب مجلس کی گفتگو کے حوالے سے اباجی رقم طراز ہیں: ہاں شرعی معاشرہ اور قرآنی احکام تو کہیں بھی رائج نہیں..... ہاں کوئی چھوٹی سے چھوٹی سلطنت یا جگہ بھی ایسی ہو جائے تو دنیا کے سامنے ایک نمونہ آجائے۔ یہی لینن نے مولانا سندھیؒ سے کہا تھا☆۔

۳۱؍مارچ کی بات چیت کا حوالہ اس طرح سے ہے: ارشد صاحب کے ہمراہ (اباجی سمیت چند دوست) حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مغرب کے بعد گفتگو بھی ہوئی۔ اسلام کا عملی نمونہ' شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تشریح' مولانا عبیداللہ سندھی کی لینن سے ملاقات اور اس کا قائل ہونا مگر نمونہ کا پوچھنا' موضوع گفتگو تھے۔

☆ مولانا سندھی سے تو لینن کی ملاقات سے انکار منسوب ہے' لیکن ایک مضبوط روایت لینن سے ملاقات کی بھی ہے۔ کچھ مصلحت بھی شاید اس میں کارفرما ہو۔ (مرتب)

۴؍ستمبر ۱۹۶۴ء کو اباجی اپنے ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور باہمی بھائی چارے پر بات چل رہی تھی۔ ''بھائیوں کو اور نزدیک لانے کی تدبیر مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کی نیکی بدی میں شرکت بتائی۔ یہ کام کسی صورت میں امداد باہمی کی مجلس سے ہوسکتا ہے۔ اگر چاہیں تو کوئی ایسی صورت تجویز کرلیں۔''

۴؍ستمبر ۱۹۷۲ء کا ایک حوالہ اباجی کی یادداشتوں میں ملتا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا سن کر جب اسٹالن نے مولانا سندھی سے سوال کیا کہ دنیا میں عملی طور پر کہیں چھوٹی سی چھوٹی جگہ پر یہ نظام رائج بھی ہے؟ تو خاموشی کے سوا مولانا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

۱۴؍نومبر ۱۹۷۴ء کو اباجی چند دوستوں کے ہمراہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ اباجی نے ۱۹۳۶ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے مکہ مکرمہ میں ملاقات اور استفادہ کا بیان کیا۔ احیائے اسلام کے لیے عوام کو خواندہ بنانا اور پھر تدبیر سے ایک دوسرے کے نفع نقصان میں شریک کرنا نہایت ضروری ہے۔

مولانا سندھی سے ہی متاثر ہوکر اباجی کا ایک دیرینہ خواب ایک اسلامی بستی کا قیام تھا' جہاں قرآن و حدیث کے احکامات کے مطابق لوگ اپنی زندگی بسر کریں۔ اسی تخیل کو عملی صورت دینے کے لیے اباجی نے دیگر احباب سے مل کر ''انجمن رضوان امداد باہمی لمیٹڈ'' کی بنیاد پچاس کی دہائی کے اوائل میں رکھی۔ اور آگے بڑھتے بڑھتے بالآخر پنجاب یونیورسٹی' نیو کیمپس سے ملحق وحدت روڈ پر ایک خاصا بڑا قطعہ اراضی رہائشی کالونی کے لیے حاصل کر لیا گیا۔ آگے کا قصہ طویل ہے۔ اسلامی اصولوں پر چلنے کا عہد کرنے والے ساتھیوں نے دینی لبادہ اتار کر دنیاوی چولا پہن لیا اور تمام عہد و پیمان کو پس پشت ڈال دیا۔ بقول اباجی یوں شامت اعمال سے تمام منصوبہ خاک میں مل گیا۔ بعد میں زمین بھی مقدمے کے ذریعے یونیورسٹی نے حاصل کرلی اور کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

یادداشتوں کی تشنگی دور کرنے کے لیے آخر میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے چند اقوال دوبارہ پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

> ''یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں اور انہیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو' یہ گھروندے زمانہ کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمہارا تمدن' تمہارا سماج' تمہارے افکار' تمہاری سیاست اور تمہاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو' لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں' تم مذہب کا نام لیتے

ہو‘ لیکن یہ مذہب تمہاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو!‘‘

ایک اور ارشاد ہے:

’’بدلو ورنہ زمانہ تمہارا نشان تک بھی نہ چھوڑے گا۔ سنبھلو ورنہ مٹا دیے جاؤ گے!‘‘

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

’’انقلاب کا جذبہ ہی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے اور جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف و خطر زندگی کی کش مکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ فرسودہ اور بے کار دستوروں کو تو چھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح ڈال دیتا ہے۔ یعنی عمل کا مظہر اَتم ذوقِ انقلاب ہے۔ اور یہی ذوقِ انقلاب‘ فکر اور عمل میں تعمیر و تخلیق کا باعث بنتا ہے۔‘‘

یہاں بے اختیار علامہ اقبال کا شعر نوکِ قلم پر آ گیا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب‘ موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات‘ کشمکشِ انقلاب!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ رب العالمین قرآن عظیم کی تعلیم سے تمام اقوام عالم میں متقی جماعتیں پیدا کرنا چاہتا [ہے۔] تقویٰ کے تفسیر میں امام المرشدین سیدنا الشیخ عبدالقادر الجیلانی کا ارشاد ہے ہو العمل بقولہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (۱۶ : ۹۰) میری خیال میں حضرۃ الشیخ کی تفسیر اس آیۃ سے ماخوذ ہے اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (۵ : ۸) اس لئے قرآن عظیم کے مطالعہ میں اسی آیۃ کو نصب العین بنانا چاہئے واللہ الموفق حضرۃ الشیخ کا قول غنیۃ الطالبین فصول المواعظ میں ملیگا فقط

عبیداللہ السندی الدیوبندی
سابق ناظم نظارۃ المعارف دھلی

حارۃ الباب - مکہ معظمۃ
۲۴ ذی القعدۃ ۱۳۵۴ھ
۱۷ فروری ۱۹۳۶ ھندی

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کے لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ناصحانہ تحریر کا عکس
واضح رہے کہ ۱۹۳۶ ہندی سے مراد ۱۹۳۶ عیسوی ہے

قیامِ حجاز کے بعد وطن لوٹتے ہوئے فرمایا:

’’میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر اٹھے گا‘ لیکن خارج میں اس کا وہ ڈھانچا نہیں ہوگا جو اِس وقت ہے۔ مجھے جس طرح اس بات پر یقین ہے کہ اسلام ایک بار پھر اُبھرے گا‘ اسی طرح میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ہمارا موجودہ ڈھانچا اب چند دنوں کی چیز ہے۔‘‘

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور اباجی

میٹرک کے بعد اباجی نے کوئٹہ سے آ کر اسلامیہ کالج‘ ریلوے روڈ‘ لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا اور ہاسٹل میں مقیم ہوئے۔ اس دوران ۲۰۔ ۱۹۱۹ء میں اباجی خواجہ عبدالحی فاروقی کے درسِ قرآن سے متعارف ہوئے‘ جو قریب ہی ایک چوبارے پر ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ہاں مولانا احمد علی کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ انہوں نے ہی اباجی کو حضرت مولانا لاہوری کے پاس بھیجا‘ جن سے اباجی بیعت بھی ہوئے اور پھر آپ کو وہاں سے خلافت بھی ملی۔ دادا جان کی گورنمنٹ ہائی سکول‘ کوئٹہ میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے بوجہ ہیضہ ناگہانی موت کے بعد اباجی کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسی اسکول میں بحیثیت ماسٹر ملازمت کرنی پڑی۔ پرائیویٹ ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد آپ کو ایم اے انگلش میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء آپ حصولِ تعلیم اسی کالج کے ہاسٹل میں مقیم رہے۔ تعلیمی مصروفیات کے ساتھ آپ حضرت مولانا احمد علیؒ سے بھی فیضیاب ہوتے رہے اور آپؒ کے شروع کردہ (سہ ماہی) دورۂ تفسیر قرآن کی جماعت (علماء کلاس) میں داخلہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ رمضان المبارک میں اباجی (حضرت لاہوری کی) جامع مسجد شیرانوالہ میں ہی معتکف رہے۔ اسی اعتکاف کے دوران حضرت مولانا احمد علیؒ بنفس نفیس اباجی کے لیے سحری‘ افطاری لاتے رہے۔

حضرت لاہوری کا ایک واقعہ بھی اباجی اکثر سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک مجذوب ملا اور کہنے لگا کہ مجھے آدمی کی تلاش ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا یہ سب آدمی نہیں؟ اس نے جواب دیا: کہاں ہیں؟ اب جو حضرت لاہوری نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو کہیں بندر بیٹھا ہے‘ کہیں خنزیر ہے‘ کہیں کتا بیٹھا ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ بس

ایک لحظہ کو یہ منظر تھا اور گویا انسان کی اندرونی حقیقت کی عکاسی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت لاہوریؒ لاہور سے کہیں باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ دورانِ سفر جمعہ کا دن آتا تھا۔ حضرت نے اباجی سے کہا کہ وہ تقریر کریں اور جمعہ پڑھائیں۔ اباجی نے جب نہ کبھی نماز جمعہ پڑھانے اور نہ ہی تقریر کرنے کا عذر کیا تو حضرت نے فرمایا کہ ماسٹر کا تو کام ہی بولنا ہے۔ اس پر اباجی کو تعمیل حکم کے سوا چارہ نہ رہا۔ پھر اکثر لوگوں نے تحسین کی اور حضرت تک اپنے جذبات کو پہنچایا (جو حضرت کی خوشنودی کا بھی باعث بنا)۔ ایک اور واقعہ کے بھی اباجی راوی ہیں کہ ایک دفعہ وہ اور حضرت مولانا کسی کام اور ملاقات کے لیے اکٹھے گھر سے نکلے۔ اہل خانہ میں سے کوئی اور نہ ہونے کی وجہ سے حضرت نے گھر کو تالا لگا دیا۔ راستے میں حضرت لاہوری نے توجہ کی تو چابی گم پائی۔ اس پر آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا شروع کر دیا۔ جب فارغ ہو کر واپس ہوئے' گھر پہنچے تو دیکھا کہ تالا تو اسی طرح لگا ہوا تھا اور چابی نیچے دہلیز پر محفوظ پڑی تھی۔

۱۹۱۹ء میں حکومت کی طرف سے جلا وطنی ختم ہونے پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اس دوران مختلف اسفار' ملاقاتوں اور تجربات کی وجہ سے مولانا سندھی کے خیالات' دینی تصورات اور شخصیت میں ایک تغیر رونما ہو چکا تھا' جس کی بنیاد پر کچھ عرصے کے بعد حلقہ دیوبند کے پرانے بزرگوں سے آپ کے اختلافات کی ابتدا ہو گئی اور بڑھتے بڑھتے طریقہ کار میں مخالفت تک بھی نوبت پہنچ گئی۔ اسی ضمن میں مولانا احمد علیؒ سے بھی آپ کا اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بقول اباجی مولانا سندھی کا خیال تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر درس و تدریس کی بجائے عام لوگوں میں گھل مل کر اور مختلف عوامی جگہوں میں پہنچ کر وعظ و تبلیغ کی جائے۔ جبکہ مولانا لاہوری کا ذہن تھا کہ بزرگوں کی نسبت سے ایک جگہ بیٹھ کر ایمان کی شمع روشن کی جائے' پروانے خود بخود پہنچ جائیں گے' شیخ کی صحبت میں رہ کر اور عملی تربیت حاصل کر کے فیض پائیں گے۔ اس وقتی شکر رنجی کے عالم میں دونوں بزرگ اباجی کے حوالے سے نامہ و پیام کرتے۔ اباجی نے بھی ان کے اعتماد کا حق ادا کیا۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مختصراً سوانح حیات درج ذیل ہیں۔ آپ حضرت والا کی ولادت ۲ر رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ' قصبہ جلال (ضلع گوجرانوالہ) میں ہوئی۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ (نومسلم) نہایت دیندار اور چشتی سلسلے سے منسلک تھے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی والدین نے نذر مانی تھی کہ اگر لڑکا ہوا تو اسے دین اسلام کے لیے وقف کریں گے۔ پہلے آپ نے قصبہ تلونڈی کھجوروالی کے اسکول میں داخلہ حاصل کر کے پرائمری پاس کی۔ اس

کے بعد والد نے آپ کو مولانا عبدالحق' خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ کے درس میں بٹھا دیا۔ اس دوران مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند سے فارغ ہو کر حضرت کے والد محترم سے قرابت داری کی بنیاد پر ملنے آئے تو والد محترم نے حضرت کو مولانا سندھی کے سپرد یہ کہتے ہوئے کر دیا کہ ہم نے اس بچے کو دین کی راہ میں وقف کیا ہے' قبول کیجئے۔ مولانا نے گلے لگایا اور اپنے ساتھ سندھ لے گئے اور حضرت خواجہ غلام محمد دین پوریؒ کے ہاں مقیم ہوئے۔ آپ نو دس برس کے ہوئے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حضرت دین پوری نے حضرت لاہوری کی والدہ کا نکاح حضرت سندھیؒ سے کرا دیا تاکہ چھوٹے بہن بھائیوں کی صحیح طریقے سے نگہداشت ہو سکے۔ لیکن قسمت کی بات کہ والدہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں اور حضرت کو کم سنی میں ہی ماں کی شفقت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ یہ وقت حضرت لاہوری کے لیے بہت ہی مشقت والا تھا۔ حضرت سندھیؒ آپ کو اپنی سخت گیر طبیعت کی وجہ سے ہر وقت مصروف رکھتے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا' گھر کا پانی بھرنا' چھوٹے بھائیوں کے کپڑے دھونا وغیرہ۔ اس پر مستزاد کہ حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لانا۔ قدرت یونہی آپ کو آنے والی زندگی کے مصائب کے لیے تیار کرتی رہی۔ حضرت سندھی کے گھر سے دو روٹیاں آتیں' ایک آپ کھاتے' ایک حضرت لاہوری کو دیتے۔ اگر پیٹ نہ بھرتا تو جنگلی پھلیوں سے کام لیا جاتا۔ اس دوران حضرت تاج محمود امروٹیؒ اور حضرت غلام محمود دین پوریؒ نے آپ کو سلسلہ قادریہ میں بیعت کر لیا۔

۱۳۱۹ھ میں مولانا سندھی نے گوٹھ پیر جھنڈا میں ایک مدرسہ ''دارالرشاد'' کھولا اور حضرت لاہوری کو بھی تعلیم دین کے لیے وہیں بلا لیا۔ تقریباً چھ برس میں آپ نے درس نظامی کی تکمیل کر لی اور ۱۳۲۷ھ کے اوائل میں آپ کی دستار بندی ہو گئی۔ بعدازاں اسی مدرسے میں آپ مدرس مقرر ہو گئے۔ اس دوران حضرت سندھی نے اپنی صاحبزادی سے آپ کا نکاح کر دیا' جس سے ایک بیٹا بھی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد نومولود اور پھر اس کی والدہ بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ اس کے بعد آپ کا نکاح حضرت مولانا ابومحمد احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوا۔ دیوبند کی مسجد میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے نکاح پڑھایا۔ حضرت سندھی کے حکم سے حضرت لاہوری نے نوابشاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دین کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جمعیت الانصار' نظارۃ المعارف دہلی اور تحریک ریشمی خطوط حضرت شیخ الہند کے اس عظیم انقلابی پروگرام کی اہم کڑیاں تھیں جو آپ اتحاد عالمِ اسلام اور

آزادیٔ ہند کے لیے بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی کو کابل اور حضرت لاہوری کو دہلی تعینات کیا گیا اور حضرت شیخ الہند خود انتظامات کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ مولانا سندھی' حضرت لاہوری کو پہلے ہی نواب شاہ سے دہلی بلا چکے تھے۔ پھر کابل روانگی کے موقع پر جہاں آپ نے اپنی تحریک کے لیے خلافت ترکی کی حمایت حاصل کی' اپنی غیر موجودگی میں نظارۃ المعارف' دہلی کا انتظام اور درس و تدریس حضرت لاہوری کے سپرد کر گئے۔ تحریک ریشمی خطوط کے کارکن آپس میں خط و کتابت اور رابطہ کے لیے زرد ریشمی کپڑوں پر تحریریں بھیجا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے اگست ۱۹۱۴ء میں کچھ اہم خطوط مخبروں کے ذریعے انگریزی حکومت کے ہتھے چڑھ گئے اور یوں اس تحریک کا انکشاف ہو گیا۔ اب رہنماؤں اور کارکنوں کو بیک وقت اس طرح گرفتار کیا گیا کہ ایک کو دوسرے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ حضرت شیخ الہند حجاز سے اور حضرت لاہوری دوران درس دہلی سے گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ عرصہ آپ کو دہلی رکھا گیا۔ پھر شملہ اور لاہور سے ہوتے ہوئے آپ جالندھر منتقل کر دیے گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے آپ کو راہوں جیل بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو لاہور منتقل کر کے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ لیکن ساتھ یہ پابندی بھی تھی کہ آپ لاہور سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔

قیام دہلی کے دوران مولانا سندھی نے حضرت لاہوری سے عہد لیا تھا کہ وہ تمام عمر درس و تدریس قرآن کرتے رہیں گے۔ حضرت لاہوری بھی بتمام و کمال اس عہد پر پورے اترے اور تقریباً نصف صدی آپ نے درسِ قرآن دیا۔ لاہور پہنچتے ہی حضرت نے ایک چھوٹی مسجد میں درس قرآن شروع کیا' جو حاضرین کے بڑھنے پر مسجد لائن سبحان خان' اندرون شیرانوالہ دروازہ منتقل ہو گیا۔ اس کے علاوہ حضرت نے لاہور میں کئی ایک مساجد بھی تعمیر کروائیں۔

۱۹۱۷ء کے آخر یا ۱۸ء کے شروع میں حضرت لاہوری نے پہلا سفر حج کیا۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو برصغیر میں تحریک خلافت شروع ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ خلیفۃ المسلمین اور ترکی خلافت کی حمایت میں خلافت کمیٹیاں بن چکی تھیں۔ اسی دوران تحریک ہجرت کا بھی آغاز ہو گیا اور مسلمانانِ ہند گروہ در گروہ ہجرت کر کے افغانستان جانا شروع ہو گئے۔ چنانچہ حضرت لاہوری بھی پنجاب کے ایک قافلے کے امیر بن کر افغانستان تشریف لے گئے اور مولانا سندھی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس اثنا میں امیر امان اللہ خان والیٔ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ طے پا جاتا ہے جس کی رو سے تمام مہاجرین کی واپسی لازمی ہے۔ مولانا سندھی

بمشکل آپ کو ہندوستان واپسی کے لیے راضی کرتے ہیں۔ حضرت لاہوری کابل سے لاہور واپسی پر دوبارہ درسِ قرآن شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کے وصال تک اس کے شروع سے آخر تک تین دور مکمل ہوئے۔

۱۹۲۲ء میں حضرت نے اشاعت قرآن حکیم اور سنت نبی کریم ﷺ کے لیے انجمن خدام الدین قائم کی۔ عربی مدرسہ قاسم العلوم کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا۔ ۱۹۲۵ء میں حضرت نے ترجمۃ القرآن کا کام شروع کیا جو کہ ۱۹۲۷ء میں اختتام پذیر ہوا' اور یہ مترجم اور محشی قرآن پاک انجمن خدام الدین کے تحت شائع ہوا۔ انجمن ہی کے تحت حضرت کی سرپرستی میں بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے ایک ادارہ مدرسۃ البنات ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا۔ اس کے علاوہ انجمن کا ایک شعبہ نشر و اشاعت ۱۳۴۵ھ میں قائم ہوا جس کے تحت دینی تعلیم کے ہزاروں پمفلٹ شائع ہوئے اور اکثر مفت تقسیم کیے گئے۔ حضرت لاہوری کے درسِ قرآن کے دو اوقات تھے۔ فجر کی نماز کے بعد عام درس قرآن ہوتا تھا۔ بعد از نماز مغرب کا درس انگریزی دان طبقے اور کالج کے طلبہ کے لیے مخصوص تھا۔ ان دروس کے لیے سوائے سفر حج یا بیرونِ لاہور اسفار کے چھٹی کا کوئی تصور نہ تھا۔ درس قرآن سے آپ کے عشق کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ درس قرآن کے لیے تشریف لائے' پورے اطمینان سے درس دیا' اور جب درس ہو چکا تو پتا چلا کہ آپ کی بیٹی کی میت گھر میں پڑی ہے اور اب اس کی نماز جنازہ ہے۔ مزید برآں آخر شعبان میں مدارس دینیہ کے فارغ التحصیل علماء کے لیے ایک خصوصی درسِ قرآن (ترتیب آیات) کا آغاز ہوتا جو کہ آخر شوال میں اختتام پذیر ہوتا۔ یہ درس روزانہ تین تین' چار چار گھنٹے جاری رہتا تھا۔ آخر میں امتحان ہوتا اور پھر طلبہ میں اسناد تقسیم کی جاتیں۔ یہ عرفِ عام میں 'علماء کلاس' کہلاتی تھی۔ کبھی خصوصی طور پر خصوصی شرکاء کے لیے حجۃ اللہ البالغہ کا درس بھی ہوتا' جس کے آخر میں امتحان ہوتا اور اسناد بھی تقسیم ہوتیں۔ ہر جمعرات کو بعد از نماز مغرب حضرت مسجد شیرانوالہ میں مجلس ذکر بھی کراتے اور جمعہ بھی آپ ہی پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مواعظ اور خطبات تحریری شکل میں دستیاب ہیں۔

۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں بھی حضرت لاہوری نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حکومت وقت نے آپ کو گرفتار کر کے دوسرے علماء کے ساتھ پہلے ملتان جیل رکھا' پھر آپ کو لاہور جیل منتقل کر دیا گیا۔ ازاں بعد آپ کی رہائی عمل میں آئی۔

دینی خدمات کے ساتھ ساتھ سیاسی لحاظ سے حضرت لاہوری پہلے جمعیت العلمائے ہند سے وابستہ اور اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ قیام پاکستان کے بعد فیصلہ ہوا کہ جو ارکان یہاں رہتے ہیں‘ وہ دوسرے علماء کے ساتھ مل کر اپنی علیحدہ جماعت بنائیں۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان کے ۷۷ اجیّد علماء نے مل کر ملتان میں مشاورت کی اور متفق ہو کر حضرت لاہوری کو جمعیت علمائے اسلام‘ مغربی پاکستان کا امیر چن لیا گیا اور آپ تا زیست

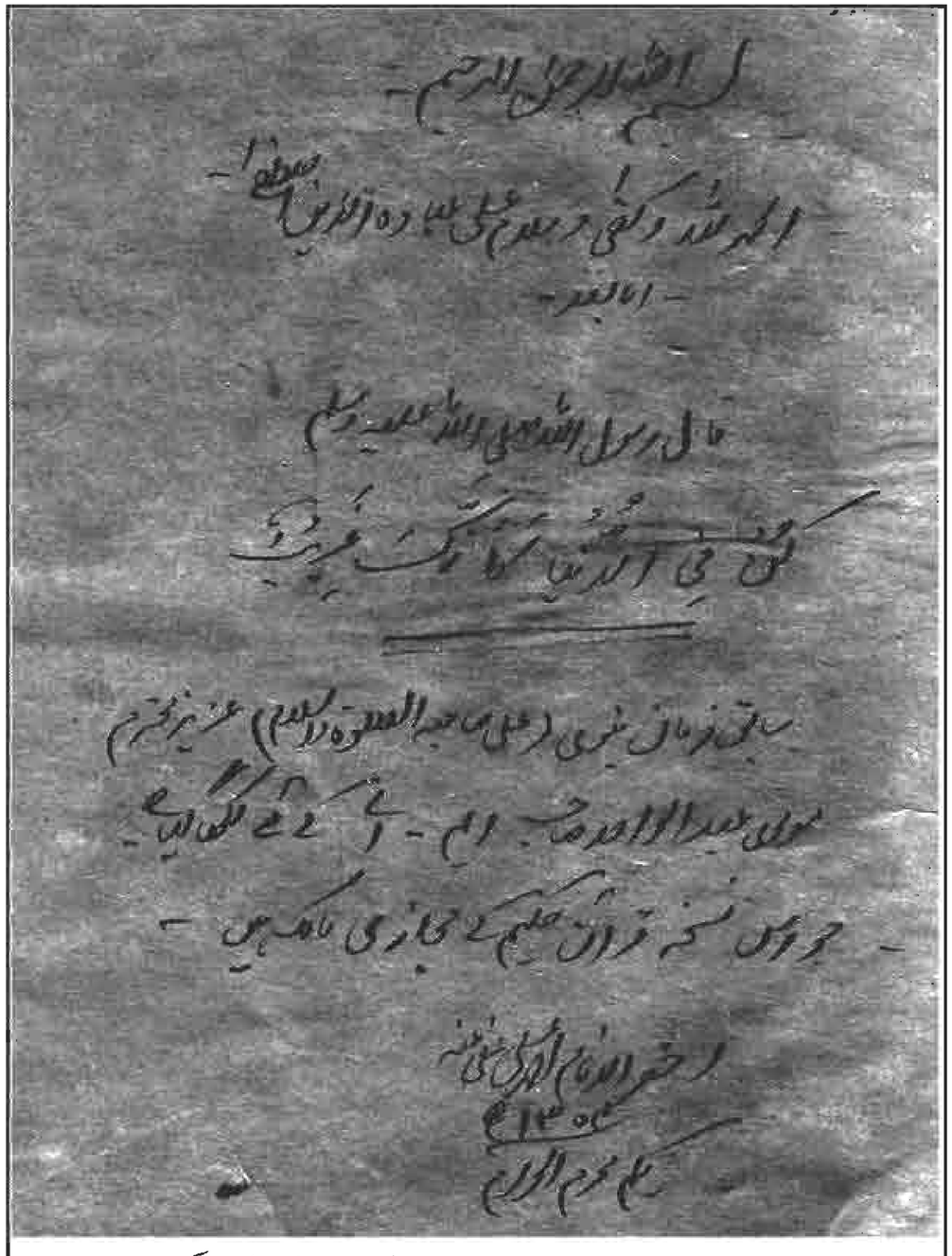

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کے لیے مولانا احمد علی لاہوریؒ کی تذکیر کا عکس

اس عہدے پر فائز رہے۔ جون ۱۹۵۷ء میں جمعیت کا رسالہ ’ترجمانِ اسلام‘ آپ کی زیر سرپرستی لاہور سے شائع ہونے لگا۔ سماجی اور رفاہی کاموں میں دلچسپی کی بنا پر ۱۹۳۳ء میں آپ کو بحیثیت عالمِ دین انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا رکن مقرر کر دیا گیا۔ انجمن کی ترقی کے معاملات میں مزید خدمات سرانجام دینے پر آپ ۱۹۵۰ء میں انجمن کے نائب صدر منتخب ہوئے اور وصال تک یہ عہدہ آپ کے پاس رہا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلۂ حق کے جو لوگ سرحد میں آباد ہو گئے تھے‘ ان مجاہدین اسلام کے ساتھ ہمیشہ حضرت کا رابطہ رہا۔ آپؒ ان کے معاونین اور مالی سرپرستی کرنے والوں میں شامل تھے اور یہ سلسلہ آپ کی زندگی میں کبھی بھی نہیں رکا۔ اسی طرح جہاد کشمیر سے بھی آپ کا خصوصی تعلق رہا۔

انہی ہمہ جہتی مصروفیات میں بالآخر ۱۹۶۲ء آ پہنچا‘ جب حضرت لاہوری نے اس دنیا سے ہجرت فرمانی تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں حضرت کو فالج اور ذیابیطس کے امراض لاحق تھے اور کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں اکثر فرمایا کرتے تھے: میں نے اللہ سے جو مانگا وہ مجھے دیا‘ میں اس سے راضی ہوں۔ جب بلائے‘ میں حاضر ہوں۔ وصال سے دو تین دن پہلے ایک خادم کو فرمایا کہ اب میں آپ کے پاس خطبہ دینے کے لیے نہیں رہوں گا۔ آپ نے کھدر کا کفن سلوا کر رکھا ہوا تھا اور قبر کی جگہ خُدام خاص کو بتا چھوڑی تھی۔ اپنی زندگی کا آخری جمعہ پڑھانے کے لیے حضرت لاہوری حسبِ معمول دس بجے اپنے گھر سے مسجد چل کر تشریف لائے اور حجرۂ خاص میں قیام کیا۔ بارہ بجے کے لگ بھگ چھوٹے صاحبزادہ حافظ حمید اللہ لباس تبدیل کرانے کے لیے پہنچے تو حضرت کی طبیعت ناساز پائی۔ پیٹ میں درد اور متلی کی شکایت تھی۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب کو ہی جمعہ پڑھانا پڑا۔ نماز کے فوراً بعد ذاتی معالج نے حضرت اقدس کی خدمت میں پہنچ کر طبی امداد دی اور گاڑی میں گھر لے گئے۔ دوائی اور ٹیکے وغیرہ لگا کر علاج ہوتا رہا لیکن افاقہ نہ ہو سکا۔ شام کو مشہور معالج ڈاکٹر محمد یوسف نے بھی آ کر معائنہ کیا۔ اگرچہ حضرت پر بے ہوشی بھی طاری ہوتی رہی‘ لیکن نماز کے وقت ہوش آ جاتا۔ مغرب تک حضرت نے تمام نمازیں حالت ہوش میں ادا کیں۔ رات کے ساڑھے نو بجے حضرت نے نماز عشاء کی نیت باندھی اور سجدے کی حالت میں ہی اللہ کا بلاوا آ گیا۔ یوں ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء بروز جمعہ بعمر ۷۷ برس حضرت لاہوری کا وصال مبارک ہوا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ نے حضرت کی اس دیرینہ دعا کو قبول فرمالیا کہ اے اللہ! جب تک تیری دنیا میں زندہ رہوں' خدمت دین کرتا رہوں اور میری کوئی نماز قضا نہ ہونے پائے۔ رات کو ہی غسل دے کر حضرت کی میت کو آپ کے رہائشی مکان اندرون شیرانوالہ دروازہ کی نچلی منزل میں رکھ دیا گیا۔ حضرت کی نصیحت تھی کہ جمعہ اور عیدین کے علاوہ درس کا ناغہ نہ کیا جائے۔ اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آپ کے بڑے صاحبزادہ مولانا عبیداللہ انور نے اگلے دن نماز فجر کے بعد آہوں اور سسکیوں کے درمیان درسِ قرآن دیا۔ مشتاقانِ دید رات سے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔

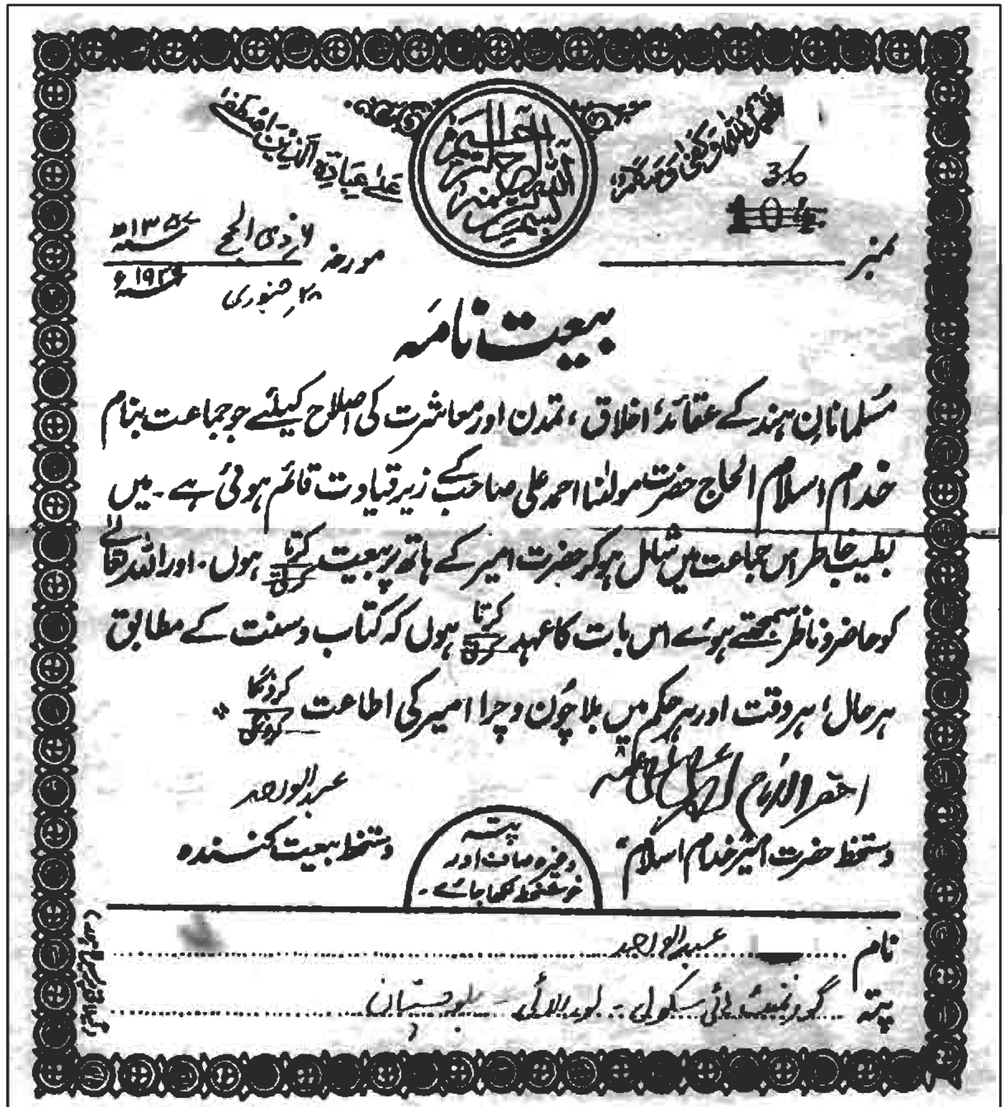

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر

مورخہ

بیعت نامہ

مسلمانانِ ہند کے عقائد' اخلاق، تمدن اور معاشرت کی اصلاح کیلئے جو جماعت بنام خدام اسلام الحاج حضرت مولانا احمد علی صاحب کے زیر قیادت قائم ہوئی ہے۔ میں بطیب خاطر اس جماعت میں شامل ہو کر حضرت امیر کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے مطابق ہر حال، ہر وقت اور ہر حکم میں بلا چون و چرا امیر کی اطاعت کروں گا۔

دستخط حضرت امیر خدام اسلام

پتہ وغیرہ صاف اور خوشخط لکھا جائے۔

دستخط بیعت کنندہ

نام

پتہ

مولانا احمد علی لاہوریؒ کے زیر امارت قائم جماعت ''خدام اسلام'' میں شمولیت کا ''بیعت نامہ''

جوں جوں دن چڑھتا گیا' سارے ملک اور لاہور سے متعلقین' عقیدت منداور علمائے کرام جمع ہوتے گئے۔ بعد نماز ظہر حلقۂ علماء میں طے پایا کہ چونکہ حضرت نے اپنے منجھلے صاحبزادے مولانا عبیداللہ انور کو اپنا قائم مقام اور اپنے بعد امیر انجمن خدام الدین بنایا تھا' اسی لیے وہی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد حضرت لاہوری کا جنازہ اٹھایا گیا۔ مکان سے جنازہ مسجد لا کر (بے پناہ ہجوم کی وجہ سے) اس کے ساتھ تیس تیس گز لمبے بانس باندھ دیے گئے۔ عقیدت مندوں کی خواہش کے پیش نظر حضرت کا رخ انور کھلا رکھا گیا تا کہ کوئی بھی شخص آپ کے آخری دیدار سے محروم نہ رہ جائے۔ شیرانوالہ دروازہ سے سرکلر روڈ پر براستہ دہلی دروازہ' اکبری دروازہ' شاہ عالمی دروازہ حضرت کا جنازہ انارکلی کے راستے یونیورسٹی گراؤنڈ بڑھتا چلا گیا۔ تقریباً ساڑھے چار بجے گراؤنڈ پہنچ کر ڈیڑھ' دو لاکھ کے مجمع کو مولانا عبیداللہ انور نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت کے جسدِ مبارک کو قبر میں اتار دیا گیا۔ آخری دعا مولانا عبداللہ درخواستی نے کروائی۔ یہاں سے جنازے نے میانی صاحب کا رخ کیا اور تقریباً افطاری کے وقت رشد و ہدایت کا آفتاب تہ خاک غروب ہو گیا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

(جاری ہے)

❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

خلافتِ راشدہ کے بعد سے
سقوطِ خلافت تک

بسلسلہ "نظامِ خلافت : کیا؟ کیوں ؟ کیسے ؟"(۴)

شجاع الدین شیخ☆

آج کا موضوع چونکہ بڑا گھمبیر، طویل اور تاریخ سے متعلق ہے، لہٰذا خشک بھی ہے اور اس حوالے سے مجھے اپنی کم علمی کا پورا اندازہ بھی ہے۔ بہرحال اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں —— ہم نے تاریخ کے اعتبار سے بڑا طویل سفر طے کرنا ہے۔ آج ہمیں اس پر گفتگو کرنی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے لے کر سقوطِ خلافت تک اُمت کن ادوار سے گزری ہے۔ سقوطِ خلافت سے ہماری مراد سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں ہوا، جب ترکی میں سیکولرزم (لادینیت) کا نعرہ لگایا گیا اور کمال اتاترک نے اسے سیکولر جمہوریہ قرار دیا۔ اس طرح رہی سہی خلافت بھی بالکل ختم ہوگئی۔ یہ تاریخ کی باتیں ہیں جس میں ہر طرح کے کردار اور واقعات موجود ہیں۔ ان پر بحث اور کوئی حتمی رائے قائم کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے۔

خلافت کے حوالے سے جو تین بڑے ادوار ہمیں ملتے ہیں —— یعنی خلافتِ بنی امیہ جس کا دور لگ بھگ ۹۰ برس پر محیط رہا، بنوعباس کا دور جو تقریباً ۷۵۰ برس تک قائم رہا، اور اس کے بعد خلافتِ عثمانیہ کا ۴۰۰ برس کا دور جو ۱۹۲۴ء میں ختم ہوا —— ان ادوار کے حوالے سے کچھ مختصر باتیں ان شاء اللہ ہمارے سامنے آئیں گی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس کی تھوڑی سی وضاحت کی طرف چلیں، بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا جو خوبصورت تجزیہ فرمایا ہے، اس کے ایک دو پہلو آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا، تاکہ کچھ الجھنیں جو بعض اوقات خلافت کے ان ادوار کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ہمارے ذہن میں نہ رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب "تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر" کے آغاز

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

میں امت مسلمہ کے عروج و زوال پر گفتگو فرمائی ہے اور سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع، جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے حوالے سے کچھ باتیں آئی ہیں، کو موضوع بحث بنا کر سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ کی تاریخ کا موازنہ پیش کیا ہے۔ سابقہ امت مسلمہ کے حوالے سے جو باتیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں بیان فرمائی ہیں، ان ہی کو ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک حدیث کی روشنی میں آگے بڑھایا ہے۔ ترمذی شریف کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "میری امت پر بھی لازماً وہ حالات آکر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے، بالکل اسی طرح جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے"۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اس حدیث کا حوالہ دے کر تفہیم القرآن میں بیان کردہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو عروج و زوال کی تاریخ نقل فرمائی اور اس کے بعد موجودہ امت مسلمہ کی تاریخ کے دو عروج و زوال کا ذکر کیا اور اس کا موازنہ تاریخ بنی اسرائیل سے کیا، جس کے نتیجے میں مذکورہ حدیث مبارکہ کی گہرائی ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل پر بیتا وہی ہمارے ساتھ بھی بیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہماری تاریخ کے دورِ عروج کا آغاز دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ میں ہوا اور یہ ہمارا سنہرا ترین دور ہے۔ اس دور میں غلبۂ دین اور اس کے برکات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہ معاملہ عربوں کے درمیان رہا اور ان کا عروج آگے بھی جاری رہا۔ خاص طور پر دورِ بنی عباس میں دنیوی شان و شوکت کے اعتبار سے مسلمانوں کو جو ترقی ملی ہے، دنیا اس کی معترف ہے۔ چنانچہ اس امت کے حوالے سے وہ اسے پہلا دورِ عروج قرار دیتے ہیں۔ دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ کے تسلسل میں بعد کے مسلمانوں کو دنیا کی ترقی اور جاہ و حشمت بالخصوص دورِ بنوعباس میں میسر آئی۔

واضح رہے کہ اسلام کا عروج اور مسلمانوں کا عروج باہمی مترادف نہیں ہے۔ اسلام میں پانچ وقت کی نماز ادا کرنا فرض ہے، لیکن بالعموم معاملہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت جمعہ کی دو رکعت تک محدود ہے۔ کیا مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل اسلام کے مطابق ہے؟ اس بات کو ڈاکٹر بلال فلپس نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا ہے کہ:

"Islam is not that Muslims do but what the Muslims are supposed to do."

یعنی اسلام وہ نہیں ہے جو مسلمان کر رہے ہیں بلکہ اسلام وہ ہے جو مسلمانوں کو کرنا چاہیے..... اور وہ تو قرآن و سنت کی تعلیمات میں ملے گا۔ چنانچہ دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ 'اسلام' کے عروج کا دور ہے اور اس کے بعد کا عروج 'مسلمانوں' کا عروج ہے، جس میں آگے چل کر بدترین ملوکیت بھی انہی خلفاء میں پیدا ہونا شروع ہوئی۔ لہٰذا ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے عروج میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔

خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے طرزِ عمل سے اسلام کی روح زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ دورِ بنی عباس (۱۰۹۹ء) میں مسلمانوں پر ایک زوال اس وقت آیا جب صلیبیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی قتل و غارت گری کا معاملہ ہوا۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان قتل کیے گئے اور اس قدر خونریزی ہوئی کہ صلیبیوں کے گھوڑوں کے گھٹنے تک مسلمانوں کے خون میں ڈوب گئے۔ اس کے بعد ۱۲۹۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کا معاملہ ہوا' جس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان قتل کیے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے تحت عروج عطا کیا۔ اس دور کی فتوحات کی وہی شان تھی جو ہمیں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں میسر آئی تھی جب مسلمانوں کی حکومت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۵۱۷ء سے سلطنتِ عثمانیہ کا آغاز ہوا اور ۱۹۲۴ء میں اس کا اختتام ہوا۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا عروج تھا جس کے بعد سے مسلمان زوال در زوال کا شکار ہیں۔ ۹۱ سال سے خلافت' جو کبھی مسلمانوں کا ایک مرکز ہوا کرتی تھی' باقی نہیں ہے اور اس کے بدترین نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

یہ تجزیہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر'' سے سامنے آتا ہے۔ اس میں ایک بات تو یہ نمایاں ہوئی کہ اسلام علیحدہ ہے' مسلمان علیحدہ ہیں۔ اسی طرح اسلام کا عروج الگ شے ہے اور مسلمانوں کا عروج الگ شے ہے۔ اسلام کا آغاز اور اس کا عروج دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ میں ہوا ہے اور اس کے بعد اسلام کی روح میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ یہ بات میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر اسرار احمدؒ خطباتِ خلافت دیا کرتے تھے اور آنے والے دور کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنایا کرتے تھے تو اس کو 'اسلام کی نشأۃِ ثانیہ' کا عنوان دیتے تھے کہ آنے والے دور میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوگی اور خلافت علیٰ منہاج النبوہ یعنی نبوت کے طریقہ پر خلافت کے آغاز کے نتیجے میں ان شاء اللہ' مکمل طور پر اللہ کی زمین پر اس کے دین کا غلبہ ہوگا۔ اس دور میں اسلام کو اتنا عروج ملے گا کہ ہر گھر میں' خواہ وہ مٹی گارے کا بنا ہو یا کسی جانور کے کھال سے بنا ہوا خیمہ ہو' اللہ اسلام کے کلمے کو ضرور داخل فرمائے گا۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک کتابچہ ہے جو انہوں نے 1967 میں تحریر فرمایا تھا ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام''۔ خلافت بنو امیہ' بنو عباس اور خلافت عثمانیہ' خلافت راشدہ کی طرح آئیڈیل ترین اسلامی خلافت نہیں تھیں' لیکن ان ادوار میں جب تک یہ خلافتیں قائم رہیں' کم و بیش مسلم امہ کو بہت سے فوائد دنیوی اعتبار سے حاصل تھے جو سقوطِ خلافت کے بعد اب ہمیں میسر نہیں ہیں۔ جب تک یہ خلافتیں قائم رہیں' مسلمانوں کی مرکزیت قائم تھی۔

یہ بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ان خلافتوں کے دوران بھی کچھ علاقے مختلف حکمرانوں کے

تحت تھے' لیکن ہر علاقے کے لوگوں کے دلوں میں مرکزی خلافت کی قدر ہوا کرتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ باوجود اس کے کہ بہت ظالم اور جابر قسم کے بادشاہ' جو اپنے آپ کو خلیفہ کہلواتے تھے' آئے ہیں' لیکن عام مسلمان اپنے مسائل کے لیے قرآن و سنت سے فیصلہ لینا چاہتے تو اس کے لیے قاضی کی عدالتیں موجود تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ان قاضیوں کو جابر خلفاء کے ظلم و ستم کا نشانہ بھی بننا پڑتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ جب تک مسلمانوں کی مرکزی اجتماعیت موجود تھی' مسلمانوں پر استعمار کی جانب سے بیرونی جارحیت نہیں ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو غلام بنا کر بدترین سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے جیسا کہ آج ہماری حالت ہے۔ پہلے ہم اتنے ممالک میں تقسیم نہیں تھے' بلکہ ایک مرکزی جمعیت کے تحت تین براعظموں میں یہ نظام چل رہا تھا۔ اس وقت ہماری فکروں پر بیرونی استعمار کے اثرات نہیں ہوا کرتے تھے' بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے اپنے اثرات موجود تھے۔ پھر اس دور میں سیکولزم کے حوالے سے بھی ایسا عام معاملہ نہیں تھا جیسا کہ آج کے مسلمان دانشوروں کی زبان پر سیکولرزم کا نام اس طرح آتا ہے جیسے کہ معاذ اللہ ان کی زبان پر کوئی مقدس وحی جاری ہے۔ آج ہمارا بچہ بچہ مغرب کی زبان اس طرح بولتا ہے جیسے کہ اس کی بنیاد یہی مغرب کی زبان ہو۔ ان بیرونی استعمار کے حملوں کے نتائج آج ہم پر حاوی ہیں' ورنہ جب مسلمانوں کی اجتماعیتیں موجود تھیں تو ہمارا تہذیب و تمدن محفوظ تھا اور ایسے فکری حملے ہم پر نہیں ہوا کرتے تھے۔

اسی طرح مسلمانوں پر ظلم و جبر کی جو صورتِ حال آج ہے' چاہے عراق کو تہس نہس کر دینے کا معاملہ ہو' چاہے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے' اور کشمیر اور فلسطین کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش بھی نہ کی جائے' تو خلافتوں کے دور میں اس سطح پر ہمارے ساتھ معاملہ بہت کم ہوا کرتا تھا۔ اجتماعیت کا فائدہ یہ تھا کہ سلطنت مضبوط ہوا کرتی تھی اور ایک عورت کی فریاد پر خلافت کی جانب سے نوٹس لیا جاتا تھا۔ نہ صرف مسلمان افواج مدد کو آئیں بلکہ ان کے کردار کو دیکھ کر یہاں سندھ کے ہندوؤں نے محمد بن قاسم کی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ جب تک یہ اجتماعی مرکزیت قائم رہی' دیگر نظریات کو باقاعدگی کے ساتھ ہمارے نظام میں گھس کر اسے تباہ کرنے کا موقع کسی صورت میسر نہیں آسکا۔ شریعت کی بالادستی کم از کم نظری سطح پر موجود تھی اور شریعت سے ریفرنس لینے کے مواقع ہمارے لیے موجود تھے۔ جبکہ آج صورتِ حال یہ ہے کہ بیرونی نظام ہائے زندگی جیسے کمیونزم' سوشلزم' کیپٹلزم' سیکولرزم کے نعرے آج ہمارے نصاب میں شامل ہیں اور ہماری فکروں پر غالب ہو چکے ہیں۔ ٹی وی اینکرز کی زبانیں یہی نعرے الاپ رہی ہیں اور ان کے نزدیک تو ان سے بہتر نظام کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیرونی نظام ہائے زندگی کی اس قدر مرعوبیت کا امکان کم از کم اس وقت نہیں تھا جب تک ہماری اجتماعیت قائم تھی۔

اب آیئے‘ اپنی تاریخ کے تھوڑے سے تاریک پہلوؤں کو بھی آپ کے سامنے رکھ دو۔ بدترین ملوکیت بھی ان ادوار میں آئیں۔ خلافت کے تحت محمد بن قاسم کو مسلمانوں کی لاج رکھنے کے لیے بنوامیہ کے دور میں سندھ بھیجا گیا‘ لیکن جب محمد بن قاسم کے حق میں یہاں مثبت اجتماعی جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے تو حکمرانوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ یہ ہیرو نہ بن جائیں لہٰذا واپس بلا کر انہیں شہید کروادیا گیا۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر کو افریقہ بھیجا گیا‘ طارق بن زیاد کو اسپین بھیجا گیا اور پھر انہیں واپس بلالیا گیا اور دونوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ یہ بالکل متضاد باتیں ہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہیں‘ لیکن ہم نے مثبت پہلو کو دیکھنا ہے کہ ہم سندھ اور اسپین تک بھی پہنچے ہیں۔ خلافت مسلمانوں کی مدد کے لیے یا اسلام کی باتوں کو آگے پھیلانے کے لیے حرکت میں آتی تھی۔ اسی طرح بنوعباس کے دور میں بھی مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا اور اس دور میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ جہاں بڑی بڑی لائبریریاں بنیں‘ تحقیق و جستجو کے کام بھی ہوئے‘ یقیناً دینی کام کو بھی آگے بڑھایا گیا تو وہیں رقص و سرود اور شراب و کباب کی محفلیں بھی جمی ہیں۔ یہ تضادات یقیناً ہمیں ملتے ہیں اس لیے کہ یہ اسلام کے عروج کے نہیں‘ بلکہ مسلمانوں کے عروج کے ادوار ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ اپنی تاریخ کی منفی باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اِن ادوار کی تھوڑی سی مثبت باتیں ہمارے سامنے آجائیں۔

اس وقت میرے سامنے مولانا زاہد اقبال صاحب کی کتاب ہے جنہوں نے بہت مختصر مگر جامع انداز میں تاریخ مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں سے کچھ باتیں میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ سب سے پہلے تین بڑی خلافتوں کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیدنا علی ؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسن ؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی مگر وہ بہت بڑے مقصد کے پیش نظر یعنی امت کو افتراق سے بچانے کے لیے خلافت سے دستبردار ہوگئے اور سیدنا امیر معاویہ ؓ اس امت کے خلیفہ بنے۔ ان کی خلافت کا عرصہ تیس برس پر محیط تھا۔ بنوامیہ کا دورِ خلافت لگ بھگ ۹۱ برس کا ہے جس کا آغاز ۴۱ھ میں ہوا اور ۱۳۲ھ تک قائم رہا (سن عیسوی کے اعتبار سے ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک ان کا دور تھا)۔ اس حوالے سے ایک تلخ بات یہ ہے کہ جو مزاج دورِ خلفائے راشدین میں اقتدار کی منتقلی اور بیت المال کے استعمال کا تھا‘ وہ بعد میں قائم نہیں رہا۔ بہت سے مواقع پر تو خلافت کے حصول کے لیے جنگیں بھی ہوئیں اور بیت المال کو ذاتی جاگیر بھی سمجھا گیا۔ اس دور میں یکے بعد دیگرے ۱۴ خلفاء ہوئے ہیں۔ انہیں آئیڈیل خلافت تو نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اسلام کی روح باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد خلافت بنوعباس کا دور ۱۳۳ھ سے کم و بیش ۹۲۳ھ تک اور سن عیسوی کے مطابق ۷۵۰ء سے ۱۵۱۷ء تک رہا۔ اس دور میں یکے بعد دیگرے ۵۵ خلفاء آئے۔ اس کے بعد تیسرا بڑا دور خلافت عثمانیہ کا ہے۔ اس کا باقاعدہ آغاز ۱۵۱۷ء بمطابق ۹۲۳ھ میں ہوا جو ۱۹۲۴ء تک قائم رہا۔ اس سلطنت کے قیام

کی کوششوں کا آغاز ۱۲۹۹ء میں ہوا تھا۔ جب بنوعباس کی خلافت ختم ہوئی تو تمام علاقے خلافت عثمانیہ کے تحت آئے۔ ۱۵۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک لگ بھگ چار سو برس خلافت عثمانیہ قائم رہی اور خلافت بنوامیہ سے خلافت عثمانیہ تک ۱۰۴ خلفاء آئے۔

ان تین ادوار کے بارے میں مولانا زاہد اقبال نے خوب عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ سیدنا علی ؓ کی شہادت کے بعد آپ کے صاحبزادے سیدنا حسن ؓ خلیفہ ہوئے تاہم چھ ماہ کے بعد وہ خلافت سے دستبردار ہوگئے اور سیدنا امیر معاویہ ؓ کو خلافت حاصل ہوئی۔ کم و بیش ۲۰ سال وہ خلیفہ رہے ہیں۔ ان کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں اور معاذ اللہ ان پر کچھ الزام تراشیاں بھی کی گئی ہیں۔ مولانا تقی عثمانی کی ایک بہت عمدہ کتاب ’’حضرت امیر معاویہؓ اور تاریخی حقائق‘‘ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے بہت بہتر جوابات دیے ہیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ ؓ صحابیٔ رسول ﷺ ہیں‘ لہٰذا ان کے بارے میں لب کشائی سے قبل لوگوں کو اپنے ایمان کو ٹٹول لینا چاہیے۔ مزید آپؓ کاتبین وحی میں بھی شامل تھے۔ ۴۳ صحابہ کرام ؓ کے نام بطور کاتبین وحی ریکارڈ پر موجود ہیں‘ جن میں حضرت امیر معاویہ ؓ بھی شامل ہیں۔ کاتبین وحی نے رسول اللہ ﷺ کی نگرانی میں وحی کو تحریر کیا کرتے تھے اور پھر حضور ﷺ اس کی تصدیق فرمایا کرتے تھے۔ آپؓ حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں دمشق کے گورنر مقرر ہوئے اور حضرت عثمان غنی ؓ کے دور میں ترقی کرتے ہوئے شام کے گورنر بھی بنے۔ یہ ذمہ داریاں خلفائے راشدین کے دور میں آپؓ کو حاصل رہی ہیں۔ آپؓ ہی کی درخواست پر حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں پہلا بحری بیڑہ تیار ہوا اور باقاعدہ بحری فوج ترتیب پائی جس نے مختلف فتوحات حاصل کیں۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں ہند‘ افریقہ اور دیگر علاقے فتح ہوئے اور ایک وسیع رقبہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا۔ سیدنا امیر معاویہؓ کے بعد خلافت یزید کو ملی ہے۔ یزید کے متعلق اہل سنت والجماعت کے علماء فرماتے ہیں کہ ہمیں اپنی زبان کو خاموش رکھنا چاہیے کہ یہ زیادہ بہتر طرزِ عمل ہے۔ مثبت اور منفی دونوں قسم کی باتیں یزید کے متعلق نقل کی گئی ہیں جو تاریخ کا حصہ ہیں۔

بنوامیہ کی خلافت کے تسلسل میں ایک بہت بڑا نام سیدنا عمر بن عبدالعزیز ؒ کا آتا ہے جن کو بجا طور پر ’عمر ثانی‘ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا دور بنوامیہ کا سب سے شاندار دور ہے جس نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کردی۔ حالانکہ آپ کا دورِ خلافت محض دو سال‘ پانچ مہینے کا ہے‘ لیکن انہوں نے اس مختصر مدت میں وہ کارنامے انجام دیے جن کی بنیاد پر ہمارے علماء نے انہیں پانچواں خلیفۂ راشد قرار دیا ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ظلم و زیادتی کا خاتمہ کرنا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے بعد کچھ خلفاء گزرے ہیں اور اس کے بعد آپؒ آئے ہیں۔ درمیانی عرصے میں کافی بگاڑ پیدا ہوا ہے‘ بیت

المال کو ذاتی جاگیر سمجھا جانے لگا اور لوگوں پر ظلم و ستم کیا جانے لگا۔ ان سب کا خاتمہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کیا۔ انہوں نے ظالم و جابر عمال کو ان کے منصب سے معزول کیا اور بیت المال کو رعایا کی ملکیت بنایا جو کہ رعایا کا حق ہے۔ ایک اہم بات کہ خطبۂ جمعہ کے آخر میں ہم سورۃ النحل کی آیت ۹۰ سنتے ہیں تو اس کا اضافہ انہی کے دور میں ہوا۔ ان کی خدا ترسی کی باتیں بھی مشہور ہیں اور ان میں تقویٰ بھی بہت تھا۔ یہ بہت مالدار آدمی تھے لیکن جب ان کو خلافت ملی تو ان میں بڑی تبدیلی آئی۔ رات کے وقت کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا تو اگر بیت المال کے پیسے سے چراغ جل رہا ہوتا اور اس کو اپنی کوئی ذاتی بات کرنی ہوتی تو وہ چراغ بجھا دیتے اور اپنے ذاتی مال سے چراغ جلاتے' اس کے بعد اس کی بات سنتے۔ ان کے بچوں کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے' لیکن خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے صرف خود کو نہیں' بلکہ بچوں کو بھی عام آدمی کے معیارِ زندگی پر لا کھڑا کیا۔

بنوامیہ کے دور کا آخری خلیفہ مروان محمد تھا جسے ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۲ھ میں قتل کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اموی خلافت کا خاتمہ ہوا۔ بنوامیہ کے دورِ خلافت میں سے بعض خلفاء کے عہد میں ملکی نظم و نسق' امن و امان' جہاد اور نئی فتوحات کے ذریعے اچھے کام سرانجام دیے گئے اور اسلامی مملکت کے تمام علاقوں میں ہمہ پہلو ترقی ہوتی رہی۔ اس کے بعد خلافت بنوعباس کا دور آیا۔ خلافت اموی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بنوعباس نے حکومت قائم کرنا شروع کی۔ ربیع الاول ۱۳۲ھ میں پہلے عباسی خلیفہ عبد اللہ سفاح کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ ایک اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ بنوعباس نے بغداد کو دارالخلافہ قرار دیا۔ بنوعباس کا دور ۵۰۷ برس پر محیط ہے اور اس میں دنیوی شان و شوکت حاصل ہوئی اور اقتدار کے حصول کی جنگیں بھی ہوئیں۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مختلف علاقوں میں آپس کی جنگ و جدال کے مواقع پر بھی بہت کم مثالیں ہیں کہ غیر مسلم باشندوں نے بغاوت کی ہو۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ باوجود بگاڑ پیدا ہونے کے' غیر مسلم یہ خیال کرتے تھے کہ ان مسلم حکمرانوں کے تحت جو حقوق انہیں میسر آ رہے ہیں' شاید وہ انہیں اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے تحت میسر نہ آ سکیں۔

بنوعباس کے خلفاء میں سے ایک بہت مشہور نام ہارون الرشید کا ہے۔ ان کا دورِ خلافت ۷۸۶ء سے ۸۰۹ء تک رہا اور عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت اسی کو حاصل ہوئی۔ اس کے دور میں بغداد اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ گیا۔ یہ خوشحالی اور علم و فن کا زریں دور تھا۔ بعد میں جب تاتاری حملہ آور ہوئے تو جس طرح ہماری لائبریریاں خالی کی گئیں کہ کتابوں کی سیاہی سے دریا کا رنگ بھی تبدیل ہوا تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علوم کی ترویج ان ادوار میں کس قدر ہوئی ہوگی۔ اس کے بارے میں کچھ منفی باتیں بھی ہیں لیکن دوسری جانب اس کی دینداری اور شریعت کی پابندی کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ ہارون الرشید علم دوست اور علماء نواز شخص بھی تھا۔ اسی کے دور میں امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام

ابو یوسف کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کیا گیا۔ اس نے بیت الحکمۃ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں کام کرنے والے علماء اور مترجمین کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ دنیا میں موجود مختلف علوم کے ترجمے یہاں ہو رہے تھے اور ہمارے علوم کے ترجمے دنیا کی دیگر زبانوں میں ہو رہے تھے' گویا خلافت کے فنڈز علوم کی ترویج میں استعمال ہوئے۔ ہارون الرشید کا یہ تذکرہ ہی قابل ذکر ہے' باقی بادہ و ساغر کی حکایتیں' جاہ و حشمت کے معاملات وغیرہ اور مسائل ہیں۔

مولانا زاہد اقبال اموی اور عباسی خلافت کے حوالے تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اموی حکومت تمام عالم اسلام پر حاوی تھی اور ایک ہی مرکز خلافت تھا۔ ایسا ہوا ہے کہ کچھ حکمرانوں نے اپنی اپنی انفرادی حکومتیں قائم کی ہیں' لیکن اس کے باوجود اجتماعیت برقرار رہتی تھی' لیکن عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد عالم اسلام کی تقسیم شروع ہوگئی۔ پہلے اندلس (اسپین) علیحدہ ہوا اور پھر اس کے بعد مراکش' افریقہ اور دیگر ممالک میں بھی انفرادی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جب عباسی سلطنت اپنی انتہائی زوال کو پہنچی تو اسی دوران منگولیا سے تاتاریوں کا طوفان اٹھا' اور عباسی سلطنت جو بظاہر کئی ممالک پر مشتمل اور بہت مضبوط نظر آتی تھی' اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ تاتاریوں پر بغداد کا حملہ ۱۲۹۸ء میں ہوا اور مسلمانوں کو بدترین قتل و غارتگری کا سامنا کرنا پڑا۔

مولانا زاہد اقبال نے اپنی کتاب میں کچھ تذکرہ سلطنت اندلس کا بھی کیا ہے۔ ۹۲ھ میں' جب بنوامیہ کا دور تھا' عظیم مسلمان جرنیل طارق بن زیاد بارہ ہزار لشکر کے ساتھ اندلس میں داخل ہوا اور ایک لاکھ عیسائی لشکر کو شکست دے کر یورپ میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ۹۶ ہجری میں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر اندلس کو فتح کر چکے تھے۔ خلافت امویہ میں امویوں کی طرف سے گورنر مقرر ہوتے رہے اور خلافت امیہ کے خاتمے اور خلافت عباسیہ کے آغاز کے بعد ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن نے اموی سلطنت کی بنیاد رکھی جو ۴۲۲ھ تک قائم رہی۔ پھر خلافت امویہ کے خاتمے کے بعد اندلس چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوا' تاہم مجموعی طور ۸ صدیوں تک مسلمان خلفاء و امراء نے یہاں حکومت کی۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی جو ترقی اندلس میں ہوئی' یہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہم جاگ رہے تھے اور یورپ سو رہا تھا اور یورپ کا نوجوان علم کی روشنی کے لیے غرناطہ اور دیگر یونیورسٹیوں میں آیا کرتا تھا۔ ہم نے ان کو علم کی روشنی دی' جستجو اور تحقیق کا جذبہ ان میں پیدا کیا اور اس کے بعد ہم سوتے چلے گئے۔

علم کی روشنی کو لے کر یورپ کا نوجوان کھڑا تو ہوا لیکن جس مذہب سے اس کا سابقہ پیش آیا' یعنی عیسائیت' اس کے مروجہ بھونڈے عقائد اس کو اپیل نہیں کر سکے۔ اس نے دنیا کو مسخر کیا اور تحقیق اور جستجو کے میدان میں آگے سے آگے بڑھتا گیا' لیکن اپنے مذہب سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہ فلسفہ ہمارے

ہاں بڑے شدومد سے پیش ہوتا ہے کہ یورپ نے مذہب کو چھوڑا ہے تو ترقی کی۔ ہم بھی اگر مذہب کو چھوڑیں گے تو ترقی کریں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ناکام مذہب نے نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ دور ہوتے چلے گئے' جبکہ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کو علم کی روشنی دینے کے بعد خود لمبی تان کر سو گئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے سورۃ الکہف پر خطبات بہت اہم ہیں جو دجال کا فتنہ' دنیا کی حقیقت' اور سائنس اور کلیسا کا تصادم کے عنوانات پر مشتمل ہیں۔ مغرب سے ہر شے ہم نے لے لی اور ساتھ ہی ان کا یہ فلسفہ بھی لے لیا کہ Religion is your private affair. It has nothing to do with the state affairs. اور آج ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ ریاست کو مذہب سے دور رکھا جائے حالانکہ ہمارے پاس جو دین ہے' وہ الہامی بھی ہے اور مکمل بھی' لیکن آج اس پر ہم مسلمانوں کی توجہ نہیں ہے۔ ہم نے آٹھ سو برس تک اندلس پر حکومت کی ہے۔ اس کے بعد دین سے دوری' عیش کوشی' خانہ جنگی اور فتوحات سے لاتعلقی نے سلطنت کو کمزور کیا اور عیسائی مختلف علاقوں پر قبضہ کرتے کرتے آخر ربیع الاول ۸۹۷ھ میں اندلس کے آخری شہر غرناطہ پر بھی قابض ہو گئے اور مسلمانوں کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا گیا وہ تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ ۱۵۵۶ء میں ایک عام حکم جاری کیا گیا کہ مسلمان عیسائیت قبول کر لیں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے۔ اس پر ہمارے ایک مؤرخ نے لکھا کہ چند سال کے عرصے میں قسم کھانے کے لیے بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کا نام لینے والا اندلس میں باقی نہ رہا۔ عیسائیوں نے سبھی کو موت کے گھاٹ اتارا' کسی کو سمندر میں ڈبو دیا' کسی کو آگ میں جلا دیا۔

آج ہمارا موضوع تاریخ سے متعلق ہے تو اس حوالے سے یہ یاد رکھیے کہ تاریخ پر نظر ڈالنے کا مقصد عبرت یا حوصلہ افزائی (motivation) کا حصول ہوتا ہے۔ عبرت اس لیے کہ سبق حاصل کرو ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا اور حوصلہ افزائی اس بارے میں کہ اگر آج تم مغلوب ہو تو اپنے اسلاف پر نگاہ ڈالو کہ ربّ کائنات نے انہیں کیا کچھ عطا کیا تھا۔ یہ ہم لوگ ہی تھے جو آٹھ سو برس تک اسپین میں برسر اقتدار رہے' جنہوں نے ہزار برس تک ہندوستان پر حکمرانی کی' پھر تین براعظموں پر بھی ہم نے حکومت کی۔ کہیں قرآن حوصلہ افزائی کے لیے ذوالقرنین کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کی انتہا پر گئے' دنیا کی چھت کی طرف گئے اس طرح آدھی دنیا تو ہو گئی۔ پھر بائیس لاکھ مربع میل پر حکمرانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کی۔ خلافت عثمانیہ کی سلطنت تین براعظموں پر محیط تھی۔ یہ ہماری تاریخ کے وہ گوشے ہیں جو آج کے مسلمان نوجوانوں کو حوصلہ افزائی (motivation) دے سکتے ہیں۔ اس تناظر میں بھی ہمیں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

خلافت بنو امیہ اور خلافت بنو عباس کے بعد تیسرا سلسلہ خلافت عثمانیہ کا ہے جس کے لیے

کوششیں ۱۲۹۹ء میں شروع ہوئیں۔ تیرہویں صدی میں کچھ ترک خاندان اناطولیہ میں جا بسے۔ وہاں ان کو ایک چھوٹی سی ریاست میسر آئی۔ سلطان عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا حکمران تھا جس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینا شروع کی۔ ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم اول نے افواجِ مصر کو قاہرہ کے قریب رضوانیہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دے کر برائے نام عباسی خلافت بھی اپنے نام منتقل کروالی۔ اس طرح خلافت کا مرکز قسطنطنیہ بن گیا اور ترک رہنما تمام عالم اسلام کے سیاسی و روحانی پیشوا قرار پائے۔ سلطنت عثمانیہ مصر' شمالی افریقہ' فلسطین اور شام وغیرہ تک پھیل گئی۔ اس وقت سلطنت عثمانیہ کی عسکری قوت کا عروج تھا۔ دو لاکھ سے زائد فوج تھی۔ تین سو توپوں پر مشتمل توپخانہ تھا۔ بحری بیڑے میں تین سو جہاز تھے۔ خشکی اور سمندر میں ترک فوجیں چھائی ہوئی تھیں۔

اس کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہم کیا کچھ تھے' ہمیں کیا کچھ دستیاب تھا اور آج ہم کس کس چیز سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس دور میں خلیفہ کو سلطان کہا جاتا تھا اور یہ سلطنت تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی۔ صوبائی نظام رائج تھا اور تمام علاقوں کو یونٹس کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر علاقے میں حاکم کو فوج کا افسر قرار دیا گیا تھا۔ ہر صوبے کی الگ مجلس شوریٰ ہوتی تھی جس کا صدر وہاں کا والی ہوتا تھا۔ غیر فوجی معاملات خصوصاً شرعی اور قانونی امور کی دیکھ بھال قاضی کے سپرد تھی۔ تینوں براعظموں میں انتظامی اکائیاں' آج کی اصطلاح میں صوبے قائم کیے گئے تھے۔ سلطنت کا اقتصادی نظام اس کے جغرافیے پر قائم تھا اس لیے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان تمام شاہراہیں تین براعظموں تک پھیلی ہوئی اس سلطنت سے گزرتی تھیں' جس سے محصول حاصل ہوتا تھا اور اس کی بنیاد پر وہ دنیا کی ایک بڑی اقتصادی قوت بن گئی۔

وہاں دنیا کی جدید ترین فوج تھی اور یہ پہلی فوج تھی جس نے بارودی اسلحے کا استعمال بھی شروع کیا تھا۔ افواج کی مدت ملازمت بیس سال تھی۔ سالانہ بھرتی پچاس ہزار کے قریب رہی۔ پہلے غیر مسلموں کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا' بعد میں انہیں بھی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے شامل کیا گیا۔ ۱۳۰۸ء میں بحیرہ بربرہ میں جزیرۂ ابرانی کی فتح عثمانیوں کی پہلی بحری فتح تھی۔ عثمانی بحریہ دنیا کی پہلی بحریہ تھی جس نے بحری جہازوں پر توپیں نصب کیں اور ۱۴۹۹ء میں لڑی گئی جنگ تاریخ کی پہلی بحری جنگ تھی جس کے دوران بحری جہازوں پر لگی توپوں کا استعمال ہوا۔ عثمانی فضائیہ کی بنیاد ۱۹۰۹ء میں رکھی گئی۔ اس طرح یہ دنیا کی قدیم ترین جنگی ہوابازی کے اداروں میں سے ایک ہے۔ اس کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب سلطنت عثمانیہ نے اپنے دو ترک ہوابازوں کو بین الاقوامی ہوابازی کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیجا تھا۔

عدالتی نظام کا جہاں تک تعلق ہے تو چیف جسٹس کو مفتی اعظم اور شیخ الاسلام کہا جاتا تھا۔ وزارت عظمیٰ کے بعد شیخ الاسلام کا عہدہ سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کا تقرر تا حیات ہوتا تھا۔ قاضیوں کا حلقۂ اختیار' ادارۂ حکومت سے زیادہ تھا۔ بڑے بڑے علاقے ان کے تحت آیا کرتے تھے۔ مملکت کے قوانین کی بنیاد شریعت اسلامیہ پر رکھی گئی تھی۔ قاضی فتویٰ یا فیصلہ دیتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تعمیل بھی کرواتا تھا۔ عثمانی سلطنت کا سرکاری مذہب اسلام تھا' لیکن اہل کتاب یعنی عیسائیوں سے اس کا اعلیٰ رویہ مسلمانوں کی وسیع القلبی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ محمد بن فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد مقامی عیسائیوں کو شہر میں رہنے کی اجازت دی اور ان کے گرجوں کو بھی بحال رکھا۔ اسلامی شریعت مملکت کا بنیادی قانون تھا۔ گویا نظری سطح پر بھی بالادستی موجود تھی اور تمام معاملات کے فیصلے بھی قرآن وحدیث سے کیے جاتے تھے اور ان دونوں سے رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں اجماع یا قیاس سے کام لیا جاتا تھا۔ ان ادوار میں علماء اور فضلاء کی بے حد تعظیم وتکریم کی جاتی تھی۔ انہیں باعزت روزگار فراہم کیا جاتا تھا۔ علم وادب کی بھرپور سرپرستی کی جاتی تھی۔ شاعری کو بھی ترجیح دی جاتی تھی اور دیگر دینی ودنیوی علوم کی ترویج کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔

ستمبر ۱۵۶۶ء میں سلطان سلیمان اعظم کی وفات ہوئی' جس کے بعد بتدریج خلافت کا زوال شروع ہوگیا۔ تین براعظموں پر پھیلی سلطنت کو بعد میں آنے والے خلفاء سنبھال نہ سکے۔ سلیمان اعظم کا جانشین سلیم ثانی پہلا عثمانی خلیفہ تھا جو میدانِ جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا اور اس میں انتظامِ سلطنت کی اہلیت بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے حملے بڑھتے گئے اور مختلف علاقوں میں خودمختار ریاستیں وجود میں آنا شروع ہوگئیں۔ انیسویں صدی میں مصر نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ ۱۸۸۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے پاس افریقہ میں صرف طرابلس باقی رہ گیا جس پر ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ اتحادیوں نے جرمنی اور ترکی کو شکست دی۔ نتیجتاً عثمانی سلطنت کے تمام علاقوں پر اتحادیوں نے قبضہ کرلیا۔ جنگ کے بعد ۱۹/اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مصطفیٰ کمال پاشا کی صدارت میں جمہوری حکومت قائم ہوئی اور آخر کار ۲/مارچ ۱۹۲۴ء کو جمہوری حکومت کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے خلافت کو بالکل ختم کرنے کا اعلان کردیا اور ترکی کو سیکولر اسٹیٹ (لادینی ریاست) قرار دے دیا۔ یوں مسلمانوں کی وحدت کی علامت اور آخری سہارے کو بھی چھین لیا گیا اور دنیا میں مسلمانوں کی رہی سہی اجتماعیت کو بھی ختم کردیا گیا۔

اسی ترکی میں سیکولرزم کا نعرہ لگا کہ

No divine intervention will be allowed in the collective affairs of life

یعنی امورِ سلطنت اور لوگوں کے اجتماعی معاملات کے گوشوں میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہوئی تو وہ مختلف ممالک میں تقسیم ہوگئے اور اب مسلمان دنیا کے کونے کونے میں تہہ تیغ ہو رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے تقریباً ۶۰ ممالک موجود ہیں اور ان میں سے اکثریت کا حال یہ ہے کہ سیکولرزم ان کا نظامِ زندگی بنا ہوا ہے۔ شریعت کہیں نافذ نہیں ہے' عدالتوں میں غیروں کا قانون نافذ ہے' کشمیر اور فلسطین پچاس سال سے زائد کے مسائل ہیں جو حل ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ عراق' افغانستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ سقوطِ خلافت کے بعد آج مسلمان اس حال پر پہنچ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پرشکوہ ماضی سے حوصلہ افزائی عطا فرمائے اور دین حق کے قیام کے لیے قبول فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مجلد 400 روپے، غیر مجلد 200 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

Jan. 2016
vol. 65

Regd. CPL No. 115
No. 1

Monthly **Meesaq** Lahore

مطالعہ قرآن حکیم' سیرتِ نبویؐ' دعوت رجوع الی القرآن' اسلامی انقلاب کا نبویؐ منہاج'
خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خدوخال' دعوت واقامت دین' اسلام کے معاشرتی، اخلاقی،
معاشی اور سیاسی نظام، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور تنظیمی وتحریکی جدوجہد پر مشتمل

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی تصنیفات وتالیفات میں سے
فکرانگیز عبارات کا خوبصورت انتخاب

ملفوظات
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتّبہ
مولانا شیخ رحیم الدین

عمدہ طباعت ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ دیدہ زیب ٹائٹل
❁ صفحات: 240 ❁ قیمت: 200 روپے

شائع کردہ:
مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501
email: maktaba@tanzeem.org website: www.tanzeem.org